باب اوّل

الہامی تصورِ حیات کے جلو میں

﴿ وما اوتیتم من العلم الا قلیلا ﴾

مکہ سے کوئی دو میل دور غارِ حرا کی تنہائی میں محمدؐ بن عبداللہ ان عظیم سوالات سے نبرد آزما تھے جو ازل سے مضطرب اور بیدار مغز قدسی نفسوں کی فکر کا محور و مرکز رہے ہیں۔ خدا کیا ہے؟ اس کائنات کی ابتداء کیسے ہوئی؟ اور کون ہے وہ ہستی جس کے وجود سے مکاں اور لامکاں کی تخلیق عبارت ہے؟ یہ کیسا بھید ہے جس کی سریت سے جس قدر نقاب اٹھتا جاتا ہے اس کی سریت میں مزید اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ خدا کا تجربہ اگر خلاقانہ ہو تو وہ انسان کو تسخیر کائنات کے فریضہ پر آمادہ کرتا ہے۔ اور اگر مستعار ہو تو انسانی ذہن ﴿وجدنا آباء نا کذالك یفعلون﴾ کے پیدا کردہ توہمات کا شکار ہو جاتا ہے۔ اور یہی تجربہ اگر تکبر و غرور کے آمیزے سے تشکیل پائے تو بغاوت اور سرکشی کو جنم دیتا ہے۔ دیکھا جائے تو انسانی تاریخ کا تمام عروج و زوال اسی ایک نکتہ کی تشریح و توضیح سے عبارت ہے۔ دنیا کے تصورِ حیات اور کائنات کے ہر سلسلے میں تمام انسانی مفروضوں کی ابتداء اور انتہاء اسی ایک نکتہ پر آ کر مرکوز ہو جاتی ہے۔

محمدؐ بن عبداللہ خانوادۂ براہیمی کی ہاشمی شاخ کے ایک ممتاز فرد تھے۔ ان کے قبیلہ قریش کو متولیانِ کعبہ کی حیثیت سے روحانی پیشواؤں کا مقام حاصل تھا۔ کعبہ کی دیکھ ریکھ اور معیاری انتظام و انصرام کے سبب مکہ کو ایک تجارتی منڈی کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ روحانی اور تجارتی سیر و سیاحت کی یکجائی کے سبب اطراف و اکناف کی دولت مکہ میں کھنچی چلی آتی تھی۔ خدا اہالیانِ مکہ کے حسی تجربے کا اب حصہ رہا ہو یا نہیں البتہ یہ بات ہر خاص و عام پر عیاں تھی کہ دینِ براہیمی

کی تجارت اوراس کی فنکارانہ ترغیب وتحریص نے وادیِ غیر ذی ذرع میں رہنے والوں پر آسائش کے وافر امکانات وا کر دیئے ہیں۔

محمدؐ اہل مکہ کے اس مکروہ کاروبارِ مذہب سے سخت متنفر تھے جہاں دین براہیمی کی باقیات کے نام پر بے مغز رسوم اور توہمات کا ایک طویل سلسلہ جاری تھا۔ یہ خیال عام تھا کہ دینِ براہیمی کی اساس کھوئی گئی ہے اور یہ کہ دین کے نام پر مکہ کی یہ چمک دمک کاروبارِ دین داری سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ایک دن زید بن عمرو جو کعبہ کی دیواروں سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے اہل قریش سے یوں مخاطب ہوئے: ''اے قریش! اس خدا کی قسم جس کی مٹھی میں میری جان ہے تم میں سے ایک شخص بھی ابراہیم کے دین پر عامل نہیں ہے سوائے میرے۔ پھر وہ تاسف بھرے انداز میں یوں گویا ہوئے بارالہا اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تیری عبادت کا صحیح طریقہ کیا ہے تو میں ضرور اسی طرح تیری عبادت کرتا لیکن افسوس کہ میں اس بات سے آگاہ نہیں۔''[۱]

مکہ کے منظّم کاروبارِ دین داری میں رب کعبہ کی حیثیت ایک ایسے خدائے معطل کی تھی جس سے دادرسی کی ضرورت اب کم ہی سمجھی جاتی تھی کہ اطرافِ مکہ کے مختلف قبائل نے اپنی اپنی خواہشات اور تمناؤں کے مطابق اپنے لیے علیحدہ علیحدہ بت تراش لیے تھے۔ ان بتوں کا تعلق حرم کعبہ سے بس اتنا تھا کہ وہ مختلف اوقات میں مکہ سے دور دراز علاقوں میں لے جائے گئے تھے۔ اس کے علاوہ جن خداؤں یا بتوں سے قبائل عرب کا کام نکلتا تھا وہ حرم کعبہ میں رکھے ہوئے تھے جن کے دیکھ ریکھ کی ذمہ داری کلید برداران کعبہ کو سونپی گئی تھی۔ عرب قبائل اپنی مطلب براری کے لیے اپنے قبائلی خدا کی پرستش اور اس کی زیارت کو نیک شگون جانتے اور اس طرح ان کی سالانہ زیارت سے مکہ کی روحانی اور تجارتی زندگی میں چہل پہل کا سماں قائم رہتا۔ گویا مذہب کے نام پر اہل مکہ نے ایک ایسے تجارتی اور سرمایہ دارانہ نظام کو قائم کر رکھا تھا جو بڑی کاریگری سے سادہ لوحوں کے مذہبی استحصال اور اس کے پس پردہ مکہ کی سرمایہ دارانہ سرگرمیوں کو مسلسل فروغ واستحکام عطا کر رہا تھا۔

محمد بن عبداللہ پر اس قرشی سرمایہ دارانہ نظام کی اصل حقیقت اوروں سے کہیں زیادہ واضح تھی۔ آپؐ اس بات پر سخت اضطراب محسوس کرتے کہ خادمینِ کعبہ نے اس عظیم وراثت کو معاشی حصول اور سماجی تفاخر کا ذریعہ بنا ڈالا ہے۔ اور یہ کہ مذہب کے نام پر یہ مکروہ تجارت سخت روحانی تشتت اور ہمہ گیر فتنہ وفساد کا سبب بنی ہے۔ حلف الفضول کے موقع پر آپؐ کو اس چشم کشا مشاہدہ کا موقع ملا کہ کس طرح مجاورانہ ذہنیت ایک پتھر کی تنصیب کے مسئلہ پر جنگ وجدل کا بازار گرم کر دیتی ہے۔

تصور توحید کے پس پشت چلے جانے کے سبب اہالیانِ مکہ اور دیگر قبائل عرب بدترین قسم کے توہمات سے دوچار

تھے۔اہم معاملات میں وہ اپنے دل و دماغ کے بجائے خشب وحجر کے تراشیدہ بتوں سے رہنمائی کے طالب ہوتے اور پھر جو اشارے حاصل ہوتے اس کے مطابق عمل کرتے۔[۲] اس توہم پرستی نے اہل مکہ کو ایک ایسی بند گلی میں پہنچا دیا تھا جہاں سے نکلنے کی کوئی سبیل دکھائی نہ دیتی تھی۔﴿وجدنا ابآنا كذالك يفعلون﴾ کی گونج میں ان کی تخلیقی صلاحیتیں اور تحلیل وتجزیہ کی قوت منجمد ہو کر رہ گئی تھی۔

جب دین مذہب یا تجارت بن جائے اور مذہب سے مادّی منفعت کا کام لیا جانے لگے تو پھر حق و باطل کا تراشیدہ معیار بھی ڈانوا ڈول ہونے لگتا ہے۔اہل مکہ حلت وحرمت کے فن میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ جب چاہا اپنی منفعت کے لیے حرام مہینوں کو مؤخر یا مقدم کرنے کا اعلان کر ڈالا اور اس طرح روایتی دین داری یا سنن معروف کے قدموں سے بھی ثبات کا پتھر کھینچ ڈالا۔مکی سرمایہ داری اور قرشی پیشوائی استحصال کی اس معراج پر جا پہنچی تھی جہاں غیر شعوری طور پر وہ خود اپنی بنیادوں پر تیشہ چلا رہی تھی۔روحانی پیشوائی ہو یا استحصالی سرمایہ داری اس کی مثال ایک ایسی مخلوق کی ہے جس کی طلب ایک مرحلے میں اتنی بڑھ جاتی ہے کہ اُسے زندہ رہنے کے لیے خود اپنے آپ کو نوالۂ تر بنانا پڑتا ہے۔یہی وہ بند گلی تھی جس میں ماقبل اسلام کا انسانی قافلہ پھنس کر رہ گیا تھا۔

بند گلی کے عمومی احساس نے قیافہ شناسوں اور مستقبل بینوں کے لیے اشارات وامکانات کی ایک نئی دنیا روشن کر دی تھی۔خبر گرم تھی کہ نئے نبی کی آمد کا زمانہ اب قریب آ پہنچا ہے۔بعض حضرات رسول موعود کی تلاش میں مختلف علاقوں میں پھرتے رہے۔پھر اس امید پر کہ شاید مستقبل کے نبی کا ظہور مکہ میں ہو وہ مکہ لوٹ آئے۔ان میں سے ہی ایک زید بن عمرو تھے جو بعثت محمدؐی سے پہلے ہی انتقال کر گئے۔اس کے علاوہ عثمان بن حریث،عبید اور ورقہ بن نوفل راہ حنیف کے متلاشیوں کی حیثیت سے مکہ میں معروف تھے۔گویا ایک عمومی بے چینی اس بات کا اشارہ تھی کہ اب وہ لمحہ آ پہنچا ہے جب پردۂ غیب سے وہ سب کچھ ظاہر ہو جس کے بارے میں عرصہ ہائے دراز سے اہل فکر ونظر سرگوشی کیا کرتے تھے۔

یہ وہی ایام تھے جب محمدؐ بن عبداللہ غار حرا میں ان سوالات سے نبرد آزما تھے جو کبھی ابوالانبیاء ابراہیمؑ کی ہم کلامی کا موضوع رہا تھا۔ابراہیم کو آفتاب کے طلوع وغروب،اس کی قوت وحرارت اور اس کی سریت پر اس غیر مرئی قوت کا گمان ہوتا جس نے اس مہیب کائنات کو رنگ و بو عطا کر رکھا تھا۔لیکن پھر بہت جلد ابراہیم کی ہم کلامی اور تلاش حق کی مساعی نے اس راز سے پردہ اٹھا دیا کہ قوت کی ان علامتوں کے آگے سجدہ ریز ہو جانا فکر ونظر کی موت ہے۔ابراہیم کی ہم کلامی کی طرح محمدؐی خلوت نشینی بھی ایک مسرت انگیز اور انقلاب آفریں تجربے سے دوچار ہوئی۔حراء میں جو کچھ ہوا اس نے آنے والے دنوں میں دنیا کی تاریخ بدل دی۔

کہا جاتا ہے کہ ایک رات جب محمدؐ غارِ حراء میں سوئے تھے وہ ایک طرب انگیز تجربے سے دوچار ہوئے،

نہ تو یہ خواب تھا اور نہ ہی عالم بیداری بلکہ ایک ایسا تجربہ تھا جس کے واقعی بیان سے انسانی زبان عاجز ہے۔ بقول محمد رسولؐ اللہ: ''میں سویا ہوا تھا کہ جبرئیل میرے پاس حریری رومال میں لپٹی ایک کتاب لائے اور کہا کہ اسے پڑھیئے۔'' جبرئیل کی اس اچانک آمد سے آپؐ خوفزدہ ہو گئے سو جبرئیل نے ایک ہاتھ آپؐ کے سینے پر اور دوسرا پیٹھ پر رکھا اور دعا کی: الھم احطط وزرہ واشرح صدرہ وطھر قلبہ۔ پھر آپ کو بشارت دی کہ اے محمدؐ مبارک ہو کہ آپ اس امت کے نبی ہیں: لا تخف یا محمد! جبرئیل رسول اللہ جبرئیل رسول اللہ الی انبیائہ ورسلہ فا یقن بکرامۃ اللہ فانک رسول اللہ۔ پھر آپ کو یہ آیات پڑھائیں: ﴿اقراء باسم ربک الذی خلق۔ خلق الانسان من علق۔ اقراء و ربک الاکرم الذی علم بالقلم﴾۔

سورہ علق کی ان آیات میں اگر ایک طرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات کی تسلی دی جا رہی تھی کہ آپ کا رب اکرم ہے جس نے انسان کو قلم کا استعارہ عطا کیا اور اسے وہ کچھ بتایا جس کا اسے علم نہ تھا تو دوسری طرف اس بات کا اشارہ بھی کہ اب لذت گوشہ نشینی کے دن ہوا ہو چکے۔

جبرئیل تو واپس چلے گئے البتہ وہ محمد رسول اللہ پر اس مسرّت انگیز اور مہیب تجربے کا لافانی نقوش چھوڑ گئے۔ آپؐ کو ایسا محسوس ہوا جیسے جبرئیل نے یہ تحریر آپ کے سینے میں لکھ دی ہو۔[۲۲] حراء کے اس تجربہ نے محمدؐ بن عبداللہ کو اب محمد رسول اللہ کے منصب پر فائز کر دیا تھا۔ اب ان کے کاندھوں پر اقوام وملل کو راہ یاب کرنے کی ذمہ داری آپڑی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اس تجربے کے بعد آپؐ دوبارہ غارِ حراء کی طرف تشریف نہیں لے گئے۔

الہامی دائرۂ فکر کی تشکیل

نئی وحی کی آمد ایک نئے دائرۂ فکر سے عبارت تھی۔ انسان اور خدا، کائنات اور اس کی ابتداء وانتہا سے متعلق تمام تر سوالوں کا مکشوف ومربوط مکالمہ اب آئندہ تیئیس[۲۳] سالوں تک قرآنی وحی کی شکل میں جاری رہنا تھا۔ قرآن مجید نے ان پر اسرار اور مہیب سوالوں سے سرّیت کی نقاب یکسر تو نہیں الٹی ہاں یہ ضرور کیا کہ انسان کو اس مہیب سرّیت سے بڑی حد تک ہم آہنگ اور مربوط کر دیا۔ اب کائنات پر اسرار خوف ودہشت کا استعارہ نہیں رہ گئی تھی جس کے مظاہر کے آگے سجدہ ریزی کی ضرورت محسوس ہو بلکہ یہ سب کچھ اس خالق کی عظیم صناعی کی نشانی سمجھی جاتی تھی۔ گویا اب تک جو لوگ فطرت کی پرستش میں مبتلا تھے وہی لوگ اس پر اسرار کائنات کو خدائے واحد کے تخلیقی استعارے کے طور پر دیکھنے اور برتنے کی کوشش کرنے لگے کہ اب کائنات کوئی معمہ نہیں بلکہ خالق کل کا تعمیر کردہ ایک ایسا زمان ومکان تھا جس کے اندر

رنگ بھرنے کا بنیادی فریضہ حاملین وحی کو انجام دینا تھا۔

نئے دائرۂ فکر کی تفہیم کے لیے لازم ہے کہ ہم ان کلیدی تصورات کا قدرے تفصیل سے تذکرہ کریں جس نے انسانی ذہن کو ایک غلغلہ انگیز تقلیبِ فکر ونظر سے دوچار کر دیا تھا۔ آنے والی تمام تر انسانی تاریخ، خواہ وہ مشرق میں ظہور پذیر ہوئی ہو یا مغرب میں، دراصل اسی تقلیبِ فکر ونظر کا توسیعہ ہے۔

سرِّ کائنات کی عقدہ کشائی

نئی وحی نے خود کو رسومِ عبودیت کی تعلیم تک محدود رکھنے کے بجائے تسخیری اور اکتشافی ذہن کے قیام کی غلغلہ انگیز تحریک برپا کی۔ روایتی مذہبی ذہن کو سخت حیرت ہوتی ہے کہ ایک مذہبی روحانی کتاب میں تخلیق کائنات کے سلسلے میں اس قدر تفصیلی بیانات کی آخر ضرورت کیا تھی۔ البتہ جو لوگ اس بات کا کسی قدر ادراک رکھتے ہیں کہ کائنات کی تخلیق ایک مستقل منصوبے کا حصہ ہے ﴿ربنا ما خلقت هذا باطلا﴾ اور یہ کہ اس کی ابتداء بھی ہے اور انتہا بھی، ان کے لیے یہ سمجھنا کچھ مشکل نہیں کہ کائنات کی اصل حقیقت سے آگہی نہ صرف یہ کہ انھیں مظاہر پرستی اور توہمات سے محفوظ رکھے گی بلکہ اس سے ایک صحت مند تسخیری اور اکتشافی ذہن کی تعمیر بھی ممکن ہو سکے گی۔ جب تک انسان کے اندر اس درجے کا ایقان پیدا نہ ہو کہ الساعۃ یا آخری لمحہ آ کر رہے گا (اجل مسمی) جب کائنات اپنے مستقر کو پہنچے گی جس کا علم یقیناً صرف اللہ کو ہے ﴿انما علمها عند ربی لا یجلیها لوقتها الاهو﴾ (اعراف: ۱۸۷) ایک معنی خیز اور بھرپور زندگی کی تعمیر وترتیب کیسے ممکن ہے؟

یہ کائنات ہے کیا اور کیسے وجود میں لائی گئی؟ کیا انسان کا محدود مشاہدہ جو صرف آنکھ کے وسیلے سے اس کے حصے میں آتا ہے اس کی ماہیت سے پردہ اٹھا سکتا ہے؟ یا پس پردہ بھی امکانات کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے۔ اس سوال کے جواب میں پہلی بات یہ کہی گئی کہ ابتداً آسمان وزمین باہم ملے ہوئے تھے پھر ہم نے انھیں ایک دوسرے سے علیحدہ کیا۔ ﴿ان السموات والارض کانتا رتقا ففتقنا هما﴾ (۲۱:۳۰) اور یہ کہ کائنات کی افزائش یا اس کی توسیع کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔[۵] ﴿والسماء بنینٰها بایید وانا لموسعون﴾ (۵۱:۴۸)۔ کہا جاتا ہے کہ کائنات جو ہر لمحہ مسلسل وسیع ہوتی جا رہی ہے بالآخر اپنے حجم میں غیر معمولی اضافہ کے نتیجے میں کشش ثقل کے اس بحران میں مبتلا ہو گی جہاں ارتقاء کا عمل معکوس شروع ہو جائے گا اور پھر یہ بڑے بڑے سیارے کشش ثقل کھو دینے کے سبب کچھ اس طرح سکڑ جائیں گے کہ بلیک ہول میں ان کا وجود غائب ہو جائے گا۔[۶] قرآنی بیان کے مطابق اس دن فضائے بسیط کو اسکرول کی طرح

لپیٹ دیا جائے گا۔لیکن بات یہیں ختم نہ ہوجائے گی کہ خدا کا وعدہ ہے کہ جس طرح ہم نے تخلیق کی ابتداء کی تھی اسی طرح اس کا پھر اعادہ کیا جائے گا۔ بقول قرآن کریم یہ ایک ایسا وعدہ ہے جسے بہرحال انجام پانا ہے ﴿وعداً علینا انا کنا فٰعلین﴾ (۲۱:۱۰۴)۔ ہوسکتا ہے کہ کائنات کی غیر معمولی توسیع کے سبب جب مادے پر مرکز ثقل کا کنٹرول کمزور پڑ جائے تو سب کچھ تہہ و بالا ہونے کا منظر قائم ہو یا فضائے بسیط میں ارض وسمٰوات کی گردش اور متعینہ راستوں پر اس کا سفر بالآخر اسکرول لپیٹے جانے کا منظر پیش کرے۔ البتہ یہ بات طئے ہے کہ بلیک ہول میں کائنات کی گم شدگی کے بعد ایک بار پھر وائٹ ہول کا منظر ہمارے سامنے ہوگا۔

قرآن جس عہد میں نازل ہو رہا تھا وہاں یہ خیال عام تھا کہ زمین جامد و ساکت ہے اور دوسرے سیارے اس کے گرد حرکت کر رہے ہیں۔ قرآن نے حقیقت سے پردہ کشائی کرتے ہوئے کہا ﴿وترالجبال تحسبها جامدةً و هی تمرُّ مرّ السحاب﴾ یعنی تمہیں لگتا ہے کہ یہ پہاڑ اپنی جگہ پر جامد ہیں جبکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ بادلوں کی مانند تیر رہے ہیں۔ یہ ہے خدا کی وہ صنّاعی کہ وہ ہر شئے کو کمال فن کے ساتھ بناتا ہے اور وہ ان تمام باتوں سے واقف ہے جو تم کیا کرتے ہو (۸۸:۲۷)۔ ایک دوسری جگہ فرمایا ﴿والقٰی فی الارض رواسی ان تمید بکم﴾ یعنی ان پہاڑوں کا اپنی جگہ مضبوطی سے جمے رہنا، آسمانوں کو بغیر ستونوں کے سنبھالے رکھنا، مختلف مخلوقات کا ظہور، آسمان سے بارش کا نزول (۳۱:۱۰) اور ان پہاڑوں کے درمیان ندیوں اور راستوں ﴿وانهٰراً و سبلاً﴾ (۱۶:۱۵) کی موجودگی سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ ہم ایک غیر متحرک اور غیر نمو پذیر چٹیل میدان کے باشندے ہیں کہ اگر ایسا ہوتا تو نمو و حرکت اور ارتقائے مسلسل کی سرّیت سے ہماری کائنات خالی ہوتی۔ لہٰذا چشم بینا رکھنے والوں کو اس حقیقت سے آگاہ کر دیا گیا کہ انھیں مسلسل تیرتے بادلوں کی طرح متحرک سمجھو۔ نہ صرف یہ کہ زمین بلکہ آسمانوں میں جو سیارے نظر آتے ہیں وہ بھی اپنے اپنے متعین دائروں میں محوخرام ہیں: ﴿کل فی فلك یسبحون﴾ (۲۱:۳۳) چاند تاروں کی حقیقت بس اتنی ہے کہ وہ اپنے کام پر لگا دیے گئے ہیں اور یہ سب معینہ منزل کی طرف اپنا سفر جاری رکھے ہوئے ہیں۔ وہی ہے مدبر الامر جو اپنی آیات کو تم پر کھول کر بیان کر رہا ہے تاکہ تم اپنے رب سے ملاقات پر یقین واثق کر سکو (۱۳:۲)۔

لیل و نہار کی گردش ہو یا شمس و قمر کا اپنے اپنے وقتوں پر ظہور اسے کسی اساطیری زبان میں پیش کرنے کے بجائے خالصتاً سائنسی انداز سے نظم کائنات کی حقیقت پر روشنی ڈالی گئی۔ مقصد یہ تھا کہ انسانی ذہن اس منظّم پر ہیبت کائنات کی سرّیت سے واقف بھی ہو اور اسے خالق کی بے پایاں قوت تخلیق کا کسی حد تک اندازہ بھی ہو جائے جیسا کہ ارشاد ہے: ان کے لیے رات کا وجود بھی ایک نشانی ہے جب ہم اس کے اوپر سے دن ہٹا دیتے ہیں تو وہ اندھیرے کی زد میں آجاتے ہیں۔ ﴿وآیة لهم الیل نسلخ منه النهار فاذا هم مظلمون﴾ (۳۶:۳۷) اور سورج کو دیکھئے تو وہ مسلسل

اپنی آخری منزل کی طرف محوِ خرام ہے اور صرف یہ سورج ہی کا معاملہ نہیں بلکہ ﴿والقمر قدرناہ منازل حتی عاد کالعرجون القدیم﴾ نہ سورج کو اس بات کی اجازت ہے کہ وہ چاند کو جا پکڑے اور نہ رات کے بس میں ہے کہ وہ دن پر سبقت لے جائے ایسا اس لیے کہ ﴿کل فی فلك یسبحون﴾ کہ سب اپنے اپنے مدار میں مقررہ قوانین کے تحت محوِ خرام ہیں (۳۶:۳۸-۴۰)۔

ارض دنیا کی تعمیر، شمس و قمر اور ستاروں کو اپنے کام پر لگائے رکھنا، سماء دنیا کو کواکب سے مزین کرنا[۸] سورج کو روشنی اور توانائی کا منبع بنانا اور چاند پر اس کی سنہری شعاعوں کا عکس ڈالنا[۹] اور پھر ان کی گردش سے لیل و نہار کو تشکیل دینا دراصل ایک بڑے منصوبے کا حصہ ہے۔ ایک ایسا منصوبہ جس کی تمام تر منصوبہ بندی ام الکتاب میں موجود ہے۔ پھر وہ خدا ہی ہے جو اس منصوبہ بندی کو تبدیل کرنے پر بھی قادر ہے: ﴿یمحوا اللہ مایشاء و یثبت و عندہ ام الکتاب﴾ (۱۳:۳۹)۔ پھر یہ ارض و سماء کی دنیا یا کہکشاؤں کا بسیط نظام ہی تخلیق کی مکمل کہانی نہیں ہے کہ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔ ابعادِ اربعہ سے آگے کی وہ دنیا جس کے بارے میں کہا گیا کہ ﴿لا تنفذون الا بسلطان﴾[۱۰] اور پھر اس سے بھی کہیں آگے جہاں تخلیق کا انسانی استعارہ ختم ہو جائے اس لامکاں کے وجود کا مژدہ سنایا گیا جہاں پہرہ بہت سخت ہے ﴿و حفظا من کل شیطٰن مارد﴾ (۳۷:۷)۔

ایک ایسے عہد میں جب کائنات کی ماہیت کے سلسلے میں واضح تصورات کا فقدان تھا۔ بلکہ کہہ لیجیے کہ کونیات (Cosmology) ایک علم کی حیثیت سے وجود میں نہیں آیا تھا، قرآن مجید نے عقل اور مشاہدے کی بنیاد پر رموز کائنات پر غور و فکر کی طرح ڈالی۔ قرآن مجید نے انسانی ذہن کی تنگنائی میں ایک ایسی کائنات کا تصور پیش کیا جہاں صرف سبع سمٰوات ہی نہیں بلکہ زمین جیسے دوسرے سیاروں کے وجود کی بھی خبر دی گئی: ﴿اللہ الذی خلق سبع سمٰوات و من الارض مثلھن﴾ (۶۵:۱۲)۔ اس امر کی وضاحت کی گئی کہ اللہ کی کائنات صرف اس سرزمین اور اس کے اردگرد کے ان سیاروں تک محدود نہیں بلکہ اس کہکشاں کی طرح نہ جانے کتنی کہکشائیں اس کائنات کا حصہ ہیں اور یہ کہ دوسری کہکشاؤں میں بھی زندگی کا وجود پایا جاتا ہے: کہ ﴿ومن آیٰتہٖ خلق السمٰوات والارض وما بث فیھما من دابّہ﴾ (۴۲:۲۹)۔ ﴿وما بث فیھما من دابّہ﴾ سے اس بات کی مزید یقین دہانی کرائی گئی کہ ذی نفوس ﴿دابّہ﴾ کا وجود صرف اس سرزمین پر ہی نہیں بلکہ اس سے پرے بھی پایا جاتا ہے اور یہ کہ وہ دن عنقریب آنے والا ہے جب خدا ان تمام ذی نفوس کو ایک دوسرے کے رابطے میں آنے کا موقع فراہم کرے گا ﴿وھو علی جمعھم اذا یشاء قدیر﴾ (۴۲:۲۹)۔ قرآن پیشن گوئیوں کی کتاب نہیں بلکہ امکانات کی کلید ہے جہاں اس امکان کی نشاندہی تو کر دی گئی کہ مستقبل میں ارض مثلھن کے سلسلے میں نہ صرف یہ کہ معلومات کا دائرہ وسیع ہوتا جائے گا بلکہ مختلف کہکشاؤں

میں پائے جانے والے ذی نفسوں سے رابطے اوران کے باہمی اجتماع کا سامان بھی ممکن ہو سکے گا۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ فضاء میں غیر مرئی قوتوں کی موجودگی یا پراسرار سرگرمیوں کے ظہور سے انسان خوف کھائے، توہمات میں مبتلا ہو اور اس کے نتیجے میں خدائے واحد کے بجائے اس کی مختلف آیات کو ہی محور عبودیت قرار دے ڈالے[۱۱]

خدا کیا ہے؟

انسان کے لیے خدا کا وجود ہمیشہ سے ایک سراالاسرار رہا ہے۔ خدا ارض وسمٰوات کی طرح وقت کا بھی خالق ہے۔ گویا ارض وسمٰوات تخلیق کی ایک جہت ہے تو وقت ایک دوسری جہت۔ نور اور ظلمات کو بھی ابعاد کی ایک الگ جہت پر سمجھا جا سکتا ہے۔ رہا خدا تو وہ تمام جہتوں سے ماوراء ہے۔ اس کے نور کی مثال ایسی ہے جیسے کسی طاق میں چراغ ہو، چراغ ایک فانوس میں ہو اور فانوس ایسا ہو جیسے کہ موتی کی طرح جگمگاتا تارا۔ وہ چراغ زیتون کے ایک ایسے متبارک درخت کے تیل سے روشن کیا جاتا ہو جو نہ شرقی ہو نہ غربی، جس کا تیل خود بخود جل اٹھتا ہو، چاہے آگ اسے چھوئے یا نہ چھوئے یوں جانو گویا کہ ہالے میں روشنی (۲۴:۳۵) جہتوں اور ابعاد سے ماورائیت ہی کا سبب ہے کہ بندہ جس طرف بھی رخ کرے خود کو اپنے رب کے جلو میں پاتا ہے ﴿وحیث ما کنتم فولوا وجوھکم شطرہ﴾ اور ایسا کیوں نہ ہو کہ ﴿ولله المشرق والمغرب﴾۔

وحیٔ ربانی نے خدا کو ایک ایسے لازوال عامل کی حیثیت سے پیش کیا جس کی صناعی اور تخلیقی قوتوں کا آبشار ہر جا رواں دواں ہو کہ وہ خالق بھی ہے اور فاطر بھی، مبدی بھی ہے اور بادی بھی، مصور بھی ہے اور باری بھی۔ تخلیق کے یہ ہنگامے جو خدا کی ذات کی مرہون منت ہیں مختلف ابعاد میں جلوہ گر ہیں۔ انشا، فطر، جعل، ودع، اوسع، بناء، رفع، ضحاً، فتق، سوّع جیسے الفاظ اسی خلق کی مختلف تعبیریں ہیں جو مختلف ابعاد میں بروئے کار لانے کی وجہ سے تخلیق کا مختلف منظر نامہ پیش کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر فتق سے اگر کائنات کی ابتداء عبارت ہے تو وسع سے اس حقیقت کا اظہار مقصود ہے کہ کن فیکون کا یہ عمل ابھی اپنے اتمام کو نہیں پہونچا ہے اور سوع اس بات کا اشارہ کہ اس عمل کی تکمیل بھی دراصل خدا ہی کے ذمہ ہے، یہ اور بات ہے کہ خدا کے بعض تخلیقی مظاہر انسانی ابعاد ثلاثہ (اور اگر وقت کو بھی ایک بعد مان لیا جائے تو ابعاد اربعہ) کے باہر ہونے کی وجہ سے انسانی فہم سے ماوراء رہ جاتے ہیں۔

خدا جو ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا، اور جس کی ازلیت اور ابدیت کے ادراک سے انسانی بیان عاجز ہے، قرآنی بیان کے مطابق ایک طرح کی صمدیت لئے ہوئے ہے۔ وقت یا زماں کی ابتداء سے پہلے بھی اس کا وجود تھا۔ خدا

کی ذات کے علاوہ بھی بعض ایسے بیانات[۱۲] وحی ربانی میں موجود ہیں جو کائنات کو مختلف الابعاد جہتوں کا حامل بتاتے ہیں۔ ﴿خلق السمٰوات والارض فی ستة ایام ثم الستوی علی العرش﴾ جیسے بیان سے اگر ایک طرف اس بات کا اشارہ ملتا ہے کہ خدا زمان ومکاں اور دیگر ابعاد سے ماوراء عرش پر جلوہ گر ہے تو دوسری طرف کرسی کی یہ وسعت کہ وہ آسمانوں وزمین کو محیط ہے اسی بات پر دال ہے کہ اس زمین پر ابعاد اربعہ کے حاملین بھی اس سے رابطے کی سوچ سکتے ہیں اور اس کی توجہ کے مستحق ہو سکتے ہیں۔ مختصراً یوں کہہ لیجیے کہ ابعاد اربعہ کے باسیوں کے لیے اس کی معرفت عین ممکن ہے البتہ یہ بات حضرت انسان کی نگاہوں سے اوجھل نہ ہو کہ خدا جس ہستی کا نام ہے اس کا ادراک ان محدود ابعاد کی دنیا میں نہیں ہو سکتا۔ ﴿لا یدرکه الابصار﴾ اور ﴿لیس کمثله شیئاً﴾ جیسے بیانات اس حقیقت کی نشاندہی کرتے ہیں کہ اس بارے میں انسانی تصور کو مہمیز کرنے کے لیے کوئی انالوجی کارگر نہیں ہو سکتی کہ وہ رب العرش العظیم ہے، رب العرش الکریم ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ابعاد متعینہ کی دنیا سے پرے یہ عرش کہاں پایا جاتا ہے؟ اس عظیم اور مہیب کائنات میں عرش کا محل وقوع اسی وقت بتایا جا سکتا تھا جب ابعاد اربعہ کے باسیوں کو لامکاں کی دنیا کا بھی کچھ اندازہ ہو۔ البتہ عرش کا وجود اور ﴿وتری الملائکة حافین من حول العرش﴾ جیسے بیان سے اس حقیقت کو ذہن نشیں کرایا گیا کہ کائنات جیسا کہ انسانوں کو نظر آتی ہے اس سے کہیں عظیم تر ہے۔ معلوم سے آگے نامعلوم کے اشارے گویا اس حقیقت کا عندیہ دیتے ہیں کہ خدا کی عظمت وجلالت انسانی حیطۂ ادراک سے باہر ہے۔

انسان کی حقیقت

انسان کیا ہے؟ کہاں سے آیا اور کدھر جائے گا؟ یہ وہ بنیادی سوالات ہیں جو ازل سے انسانی ذہن کے لیے پریشان کن رہے ہیں۔ بلکہ سچ پوچھئے تو ان سوالات کی غیر عقلی توجیہات نے انسانی زندگی میں مختلف غیر عقلی رویوں کو جنم دیا ہے۔ قرآن مجید نے اس قسم کے تمام سوالات کے جواب انتہائی نپے تلے اور محتاط انداز میں دیا جس سے اگر ایک طرف سائل کی تشفی مقصود تھی تو دوسری طرف تخلیق انسانی کی عقدہ کشائی بھی۔ ﴿هل اتی علی الانسان حین من الدهر لم یکن شیئاً مذکورا﴾ (۷۶:۱) جیسی آیت اگر ایک طرف اس حقیقت سے آگاہ کرتی ہے کہ انسان اپنی ابتداء سے پہلے عرصہ ہائے دراز تک ناقابل ذکر یا شئ غیر مذکور کی شکل میں تھا تو دوسری طرف ﴿خلقکم اطوارا﴾ (۷۱:۱۴) اور ﴿ولقد خلقنکم ثم صورنکم﴾ (۷:۱۱) جیسے بیانات سے اس حقیقت کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ انسان کی تخلیق مختلف مراحل کی رہین منت ہے۔ یہ مراحلِ تخلیق ایک طے شدہ منصوبے ﴿احسن تقویم﴾ (۹۵:۴)

کا حصہ ہیں۔ تخلیق انسانی کے سلسلے میں یہ بیان کہ ﴿وھو الذی خلق من الماء﴾ (۲۵:۵۴) اور یہ کہ ﴿خلقکم من تراب﴾ (۴۰:۶۷) اور کہیں یہ کہنا کہ ﴿خلق الانسان من طین﴾ (۳۲:۷) دراصل اس تخلیقی عمل کا سائنسی بیان ہے جس کی پراسراریت سے رفتہ رفتہ پردہ اٹھتا جاتا ہے۔

تخلیق انسانی کے سلسلے میں ﴿سلالة من طین﴾ (۲۳:۱۲) کا قرآنی بیان یا ﴿واللہ انبتکم من الارض نباتا﴾ (۷۱:۱۷) اس مرحلے کی طرف اشارہ کرتا ہے جب انسانی وجود نے ابھی وہ شکل وصورت اختیار نہیں کی تھی جس پر جنین کا اطلاق ہو سکے۔ تخلیق انسانی کا یہ دوسرا مرحلہ اور یہ سوال کہ ﴿من ای شئ خلقه﴾ (۸۰:۱۸) اور یہ جواب کہ ﴿من نطفة خلقه فقدره﴾ اس منظم اور پیچیدہ حیاتیاتی نظام کی عقدہ کشائی ہے جس پر انسان جتنا غور کرتا جاتا ہے خدائے ذوالجلال کی عظمت وہیبت سے اس کے دل ودماغ مبہوت ہوتے جاتے ہیں۔ احسن تقویم یعنی ایک مکمل اور منصوبہ بند[۱۳] انسانی جنین، جس کا سفر ﴿نطفة امشاج﴾ (۷۶:۲) یعنی مرد وزن کے اختلاط سے جاری ہے، بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے محض ایک حیاتیاتی تجربے کا نتیجہ ہے، لیکن تخلیق کے پیچیدہ عمل کا اگر گہرائی سے جائزہ لیجیے تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ خدا نے انسان کی تخلیق کو ایک عظیم منصوبے کا حصہ بنایا ہے جیسا کہ ارشاد ہے ﴿الذی احسن کل شئٍ خلقهٗ وبدا خلق الانسان من طین۔ ثم جعل نسلهٗ من سللة من ماء مهین۔ ثم سواه و نفخ فیه من روحهٖ وجعل لکم السمع والابصار والافئدة قلیلاً ما تشکرون﴾ (۳۲:۷–۹) دوسری مخلوق کے برعکس انسان اس اعتبار سے ممتاز ہے کہ اسے ﴿نفخ فیه من روحهٖ﴾ کا اعزاز حاصل ہوا اور اسے ﴿سمع و بصر و فواد﴾ کی نعمت عطا کی گئی۔ اب یہ انسان کا کام ہے کہ وہ اپنی عقل وبصیرت کو کام میں لاتے ہوئے اگر خود اپنی تخلیق پر غور کرے تو اسے کائنات اور خالق کائنات سے اپنے رشتے کی بات بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے۔

ملائکہ، جن اور غیر مرئی سرگرمیاں

قرآن مجید میں جا بجا ایسے اشارے موجود ہیں جس سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ ابھی بہت سے اسرار ورموز کا افشا ہونا باقی ہے۔ اہل ایمان اس سرّیت کا انکار کے بجائے ان رموز واشارات کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ملائکہ کو لیجیے جو ہمارے اعتقادات کا ایک حصہ ہے۔ آسمان سے زمین کا رشتہ اسی ملکوتی ایجنسی کے ذریعہ قائم رہا ہے۔ قرآن مجید میں تخلیق آدم کی تمثیل میں ملائکہ کا تذکرہ اس بات پر دال ہے کہ یہ غیر مرئی مخلوق تخلیق انسانی سے پہلے موجود تھی (۱۵:۲۸) البتہ اس کی ماہیت کے بارے میں انسانی ذہن کے لیے قطعیت کے ساتھ کوئی تصویر کشی ممکن نہیں۔

اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ ﴿بشراً من صلصال﴾ یعنی انسانی تخلیق اپنی نوعیت کے اعتبار سے جن ابعاد کی حامل ہے ان میں ملائکہ کا تصور بسببِ اختلاف ابعاد ممکن نہیں۔ یہ ملائکہ ہیں جن کی آواز کبھی ذکریا کے کان میں عین حالت نماز میں گونجتی ہے (۳:۳۹) اور جو کبھی حضرت مریم کو بشارت دیتے دکھائی دیتے ہیں (۳:۴۵)۔ کبھی بادلوں کے جلو میں خدا کی معیت میں آسمانوں سے ان کے نزول کی بات کی جاتی ہے (۲:۲۱۰) اور کبھی عرش کے گرد وہ اپنے رب کی حمد میں مصروف دکھائی دیتے ہیں۔ (۳۹:۷۵) اور کبھی اہل ایمان کو یہ بشارت دی جاتی ہے کہ اگر وہ اپنے موقف پر جم گئے تو اللہ ان کی مدد کے لیے آسمان سے ملائکہ نازل کرے گا (۴۱:۳۰)۔ گویا خدا کی ایک ایسی مخلوق کی حیثیت سے جو عام انسانوں کے حیطۂ ادراک سے باہر ہو ملائکہ کا وجود برحق ہے۔ جو مخلوق کائنات کے ان علاقوں میں رسائی کا یارا رکھتی ہو جہاں عام انسانوں کا گزر نہیں تو یقیناً وہ مختلف ابعاد اور ماہیت کی حامل ہوگی۔ ﴿تعرج الملائکة والروح الیه فی یوم کان مقدارهٗ خمسین الف سنة﴾ دراصل اسی حقیقت پر دال ہے کہ انسانی زمان و مکان کے تمام پیمانے اس ملکوتی مخلوق پر صادق نہیں آتے۔ ہاں اس دن جب یہ چہار ابعادی انسان لیل و نہار کی گردش سے آزاد ہو کر اور زمان و مکان کی بندشوں کو توڑ کر اس عالم لامکاں میں داخل ہوگا تو وہ یہ دیکھ سکے گا کہ کس طرح آسمان کو شق کرتا ہوا ایک بادل اس روز ہویدا ہوگا اور ملائکہ نزول کر رہے ہوں گے (۲۵:۲۵)۔ رہے وہ لوگ جو آخرت پر ایمان نہیں لاتے اور وہ فرشتوں کو دیویوں کے ناموں سے موسوم کرتے ہیں تو انھیں دراصل حقیقت کا کچھ علم نہیں، وہ غلط فہمیوں کا شکار ہیں اور غلط فہمیاں حقیقت تک رسائی میں مدد نہیں کر سکتیں (۵۳:۲۷)۔ انسانی حیطۂ ادراک سے پرے اس کائنات میں ایسی قوتیں ہر آن جاری و ساری ہیں جنھیں ذی روح کہیے، مخلوق کہیے، ملائکہ کہیے یا انھیں اپنی نوعیت کے اعتبار سے مختلف ناموں سے یاد کیجیے۔ واقعہ یہ ہے کہ انسان کی بصارت جو کچھ دیکھتی ہے یہ کائنات کا مجموعی ماحصل نہیں ہے۔ ارض و دنیا پر یا اس سے پرے اگر ایسی سرگرمیوں کا ظہور محسوس ہو تو اس سے خوف کھانے یا توہمات کا شکار ہونے کے بجائے تخلیق کائنات کے اسرار و رموز پر محمول کرنا چاہیے جس کی تسخیر کا کام سچ پوچھیے تو صحیح معنوں میں شروع ہونا ابھی باقی ہے۔

جن: ملائکہ کی طرح جنوں کا وجود ہمارے اعتقادات کا حصہ تو نہیں البتہ قرآن مجید میں جا بجا جنوں کے تذکرے نے قصہ گو راویوں کے لیے انتہائی زرخیز مواد فراہم کیا ہے[۱۴] قرآنی بیان کے مطابق ہمیں صرف اس بات سے مطلع کیا گیا ہے کہ انسانوں کے علاوہ ایک اور مختلف ابعاد کی حامل مخلوق جو نار سموم سے بنائی گئی ہے، اگر اس کے حرکات و اکناف کا کچھ سراغ لگے تو توہمات کا شکار ہونے کے بجائے اسے خالق کل کی صنّاعی پر محمول کرنا چاہیے۔ نار سموم یا ﴿مارج من نار﴾ ہے کیا؟ ایک ایسی آگ جس میں دھواں نہ ہو، گویا خالصتاً توانائی۔ ایک ایسے عہد میں جہاں توانائی کو مختلف شکلوں میں محفوظ اور تبدیل کرنا ممکن ہو ہمارے لیے یہ اندازہ کرنا شاید کچھ مشکل نہیں کہ نری توانائی

کس کس شکل میں جلوہ گر ہوسکتی ہے اور کیا کیا کارنامے انجام دے سکتی ہے۔لیکن مشکل یہ ہے کہ ہم مخلوق کو مروجہ ذی روح، انسانوں یا جانوروں کی شکل میں متصور کرنے کے عادی ہیں اس لیے ہمارے لیے اس غیر مرئی مخلوق کا سراپا تشکیل دینا ممکن نہیں الا یہ کہ وہ خود کسی مانوس قالب میں متشکل ہو۔قرآنی بیانات سے اس مخلوق کے بارے میں جو مجموعی تاثر قائم ہوتا ہے وہ یہ کہ ارض دنیا یا اس سے پرے نارسموم سے پیدا کی گئی یہ مخلوق ایک مختلف ابعاد کی حامل ہے یہی وجہ ہے کہ ﴿انه یراکم هو و قبیله من حیث لا ترونهم﴾

ہم جس دنیا میں رہ رہے ہیں وہ لامتناہی ابعاد کی حامل ہے۔علمائے سائنس کوئی گیارہ ابعاد کی بات کرتے ہیں جن میں ابعاد اربعہ کے علاوہ دوسرے ابعاد اب تک دانشِ انسانی کی گرفت میں نہیں آسکے ہیں۔ البتہ String Theory نے نظری طور پر اس بات کے خاصے شواہد فراہم کر دیے ہیں کہ ہمارے گرد مختلف ابعاد میں سرگرمیوں کا جو پراسرار سلسلہ جاری ہے ہم اس سے بالکل ناواقف ہیں[۱۵]۔ایسا اس لیے کہ ہم اپنی ساخت کے اعتبار سے صرف چار ابعاد (بشمول وقت) میں حرکت کر سکتے ہیں بقیہ ابعاد کے دروازے ہم پر یکسر بند ہیں۔شاید اس کا ایک سبب یہ ہے کہ ہماری حیثیت ان قیدیوں کی ہے جن کے حواسِ خمسہ مشاہدے کا محض دھوکہ دیتے ہیں۔اصل حقیقت ہماری نگاہوں سے مستور رہ جاتی ہے۔اس اعتبار سے دیکھیے تو ہم جو محض تین سمتوں کے مسافر ہیں ہماری حرکتِ عمل کی آزادی انتہائی محدود ہے۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہم اپنے اردگرد مختلف سطحوں اور ابعاد پر ایک متبادل دنیا کے خیال سے انکار کریں جہاں ہر جا غیر مرئی سرگیوں کا ظہور جاری ہے۔جنوں کی دنیا پر ہی کیا موقوف دوسرے ابعاد میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے ہم اس سے قطعاً بے خبر ہیں۔ جنت جہنم حشر نشر اور سب سے بڑھ کر یہ کہ لقائے ربی کا طرب انگیز وعدہ یہ سب دوسرے ابعاد میں ہمارے داخلے کے بغیر ممکن نہیں۔

قرآن مجید میں جنوں کے ایک گروہ کے قرآن سننے کا تذکرہ آیا ہے جو اس کلامِ عظیم کو سن کر بے ساختہ پکار اٹھے ﴿انا سمعنا قرآنا عجبا یهدی الی الرشد فامنا به ولن نشرك بربنا احدا﴾ جس سے اس بات کا اندازہ تو ہوتا ہے کہ ان کے اندر ہماری دنیا سے تعامل کی کسی قدر صلاحیت موجود ہے۔البتہ اس بات کی صراحت نہ تو قرآنی انداز تخاطب میں ہے اور نہ ہی روایتیں اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ خود رسولؐ اللہ نے انھیں دیکھا ہو یا ان کے کسی مجمع میں انھیں قرآن کی آیت پڑھ کر سنائی ہو[۱۶]۔ جنوں کے ایک گروہ کا قرآن سننا اور اسے باعث رشد و ہدایت بتانا خود وحی کے ذریعہ ہمارے علم میں لایا گیا ہے۔اس کے علاوہ قرآنی بیان ﴿یامعشر الجن و الانس الم یاتکم رسل منکم﴾ سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ ایک قابل مواخذہ مخلوق کی حیثیت سے ان کی چلت پھرت یکسر مختلف ابعادی سطحوں پر جاری ہے۔البتہ مختلف ابعادی صلاحیتوں کی وجہ سے ان پر جن بعض غیر مرئی تفوق کا گمان ہوتا ہے اس

کا حصول انسانوں کے لیے ناممکن نہیں شرط یہ ہے کہ وہ ان قوانین فطرت کی تفہیم و تسخیر اور اسے برتنے کا سلیقہ جان سکیں۔ گویا جنوں کے تذکرے اگر ایک طرف اس بات کی عقدہ کشائی کرتے ہیں کہ چشمِ ظاہر سے نظر آنے والی دنیا میں زندگی کے نغمے بیک وقت مختلف ساز اور مختلف لَے میں بج رہے ہیں تو وہیں دوسری طرف اس رمز کی طرف بھی اشارہ موجود ہے کہ ان اسرار کی عقدہ کشائی حضرت انسان کے لیے امکانات کی ایک نئی دنیا وا کر سکتی ہے۔ قصۂ سلیمان میں ملکۂ سبا کا تختِ آن واحد میں حاضر کر دینا اور یہ کہنا کہ ﴿عندہ علم من الکتاب﴾ گویا اسی نکتہ کا اعلان ہے کہ کرنے والے نے جو کچھ کیا وہ خدا کے ان قوانین فطرت کا اظہار تھا جس کے امکانات تو اس دنیا میں یقیناً موجود ہیں البتہ اس کے استعمال کے فن سے ہر خاص و عام، جن و انس واقف نہیں۔ اگر ان امور کی عقدہ کشائی ممکن ہو سکے تو آج عام انسانوں کے لیے Teleportation مستقبل کا خواب نہیں رہ جائے گا۔ البتہ اگر ان بیانات کو محض اساطیری انداز سے پڑھنے کی کوشش کی گئی تو کسی مستقبل کی دنیا کی نغمہ سنجی کے بجائے یہ بیانات ہمیں ان توہمات میں گرفتار کر سکتے ہیں جس سے چھٹکارا دلانے کے لیے قرآن مجید نازل ہوا تھا۔ بدقسمتی سے ہم صدیوں سے اسی اساطیری ذہن کے ساتھ مستقبل کے امکانی بیانات کو پڑھتے آئے ہیں جس کی وجہ سے محیر العقول قصے، کہانیوں، لایعنی صوفیانہ کرشموں اور خوابیدہ طلسماتی قصے کہانیوں کا ایک دفترِ انبوہ تیار ہو گیا ہے۔

زمان و مکان

لیل و نہار کی گردش جسے انسان وقت کا میزانیہ سمجھے بیٹھا ہے اس کی حقیقت کیا ہے؟ وقت ہے کیا اور یہ کہ مکاں اور لامکاں سے اس کا کیا تعلق ہے؟ صبح کا شام ہونا اور یوں انسانی زندگی کا رفتہ رفتہ تمام ہونا وقت کے بے رحم سلوک کے سبب ہے یا یہ سب کچھ ایک بڑے منصوبے کا حصہ ہے۔ اگر انسان نظام شمسی سے باہر کے امکانات سے ناواقف ہو یا ان سے منہ موڑ لے تو اس کے لیے کائنات میں اپنے صحیح مقام کے تعین کا امکان جاتا رہتا ہے۔ وحی ربانی نے اس بات کا خاص التزام کیا کہ انسان خود کو نظام شمسی کا قیدی سمجھنے کے بجائے اس وسیع و عریض اور لامتناہی کائنات کے باسی کی حیثیت سے اپنے گرد و پیش پر نظر ڈالے اور ان امکانات سے واقف ہو کہ کس طرح ابدیت کے جلو میں لقاء رب کے لیے اسے تیار کیا جانا مقصود ہے۔ لیل و نہار کی گردش سے تشکیل پانے والے انسانی ایام کی حقیقت کچھ بھی نہیں کہ یہ سب کچھ محض نظام شمسی کا پیدا کردہ سراب ہے۔ کائنات کے دوسرے پیمانۂ وقت کے مطابق ایک دن کبھی ایک ہزار سال پر محیط ہوتا ہے (حج: ۴۷) اور کبھی اس کی مدت پچاس ہزار سالوں تک جا پہنچتی ہے (المعارج: ۴)۔ پھر جس وقت کی

تخصیص وتعین میں ہم سیکنڈوں کا احتساب کرتے اور Leap Second کے اہتمام میں اپنی اٹامک گھڑیوں کو ازسرِنو منظّم کرنا ضروری سمجھتے ہیں، آخر اس تکلف کی اہمیت کیا ہے؟

وحیِ ربانی کے صفحات میں جابجا ایسے اشارے موجود ہیں جن سے یہ تاثر قائم ہوتا ہے کہ وقت فی نفسہٖ کچھ بھی نہیں۔ یہ دراصل ہماری اصطلاحی سوچ کا مظہر ہے ورنہ جو لمحات ہمارے لیے ہزار سال ہوں وہ کائنات کے دوسرے مقامات سے مثل یوم قرار پا سکتے ہیں۔ اس دن جب بندوں سے پوچھا جائے گا کہ تم کتنی مدت تک زمین پر رہے تو ان میں سے بعض کہیں گے کہ بس ذرا دیر (۵۲:۱۷) اور بعضوں کو ایسا محسوس ہوگا جیسے زمین پر ان کی تمام زندگی کوئی ایک گھنٹہ سے عبارت ہو (۴۵:۱۰) اور بعض کہیں گے گویا ایک دن یا اس کا کچھ حصہ (۲۳:۱۱۳)۔ یہ تو ان انسانوں کا احساس ہوگا جنھوں نے اپنی تمام زندگی لیل ونہار کی قید میں بسر کی ہوگی۔ رہی وہ ہستی جو ان تمام قیود سے ماوراء اور تمام معلوم اور نامعلوم ابعاد سے بالاتر ہے یقیناً وہی اس حقیقت کی عقدہ کشائی کر سکتی ہے اور جسے صحیح معنوں میں ابدیت کی دنیا میں داخل ہوئے بغیر نہیں سمجھا جا سکتا۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ ابدیت فی نفسہٖ نظامِ شمسی کی پیدا کردہ اصطلاح ہے جس کے واقعی ابعاد سے ہمارے حواس ناآشنا ہیں۔ ہم اگر وثوق کے ساتھ کوئی بات کہہ سکتے ہیں تو وہ صرف یہ کہ زماں ہوں یا مکاں، یہ نہ ابدی (absolute) حقیقت ہیں اور نہ ہی اضافی (relative)۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ہمیں مستقبل کو ان اصطلاحات سے ماوراء متصور کرنا چاہئے۔

قرآن مجید میں وقت کا تصور دراصل ہمیں اس اصطلاحی طرزِ فکر سے نجات دلانے کے لیے بیان ہوا ہے جو ہماری تفکیر کو خانوں اور اصطلاحوں کا قیدی بناتا ہے۔ بالفاظ دیگر یہ کہہ لیجیے کہ قرآن چاہتا ہے کہ ہم اس محدود دنیا کے فکری اور نفسیاتی طرزِ فکر کا اسیر ہونے کے بجائے ان حقائق پر کمندیں ڈال سکیں جہاں زمان ومکان یکسر اپنی معنویت کھو دیتے ہیں۔ ﴿ویوم تقوم الساعة﴾ (الروم:۱۴) یا ﴿عنده علم الساعة﴾ (لقمان:۳۴) وقت کے تعین کے ساتھ ساتھ مستقبل کی اس دنیا کا منظر نامہ پیش کرتے ہیں جہاں وقت کا موجودہ تصور باطل ہو جائے گا۔

ذرا غور کیجیے اس لامتناہی اور مہیب کائنات میں جہاں ارب ہا ارب کہکشاؤں کی جلوہ سامانیوں کو حیطۂ ادراک میں لانا ہمارے لیے ممکن نہ ہو اور جن کی وسعت کا یہ عالم ہو کہ وہ ہر لمحہ ارتقاء ونمو کے عمل سے دوچار ہو اور جس کے نتیجے میں یہ کائنات مسلسل وسیع ﴿لموسعون﴾ ہوتی جاتی ہو، اس میں ہماری زمین کی حیثیت ایک ذرۂ غبار کی بھی نہیں پھر اگر ہم اس غلط فہمی کا شکار ہوں کہ تاریخ کے تمام بڑے کارنامے ہماری سرزمین پر انجام پاتے رہے ہیں، عبقری شخصیات کا ظہور، باجبروت حکمران وسلاطین کی داستانیں ہماری زمین پر ہی لکھی جاتی رہی ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہم اپنی سائنسی ترقیوں اور تمدنی عظمتوں کو ورلڈ ہسٹری یا ماحصل کائنات سمجھنے کی غلط فہمی میں مبتلا ہوں تو ہمیں یہ جان لینا چاہیے

کہ خدا کی اس مہیب کائنات میں ہماری حیثیت شاید اب بھی ﴿لم یکن شیئاً مذکورا﴾ کی ہے۔ تا آنکہ خدا ہم لیل و نہار کے قیدیوں کو ابدیت کی فضائے بسیط عطا کرے جس کا علامیہ لقائے ربی کا وعدۂ جانفزا ہے۔

خدا اول بھی ہے اور آخر بھی، ظاہر بھی ہے اور باطن بھی۔ گویا اول سے آخر تک کا زمانی پیمانہ اور ظاہر سے باطن کے مکانی ابعاد، یہ سب کچھ فی نفسہٖ کچھ نہیں۔ ہاں انسانوں کو زمان و مکاں کچھ اس طرح نظر آتے ہیں، کہ جب کچھ نہ تھا اسی کی ذات تھی اور جب کچھ نہ ہوگا تب بھی باقی وہی رہ جائے گا۔ ظاہر بھی وہی ہے جو کہ باطن ہے پھر مکانی ابعاد کی کوئی حقیقت ہے اور نہ ہی مکاں اور لامکاں میں کوئی فرق۔ جس طرح وقت فی نفسہٖ کچھ ہے نہیں بلکہ نظم کائنات کا پیدا کردہ سراب ہے اسی طرح یہ خیال بھی باطل ہے کہ زندگی کی جلوہ سامانیوں یا مادی زندگی کی ترتیب و تنظیم کے لیے مکان کا وجود عین لازم ہے۔ کن فیکون کی اس کائنات میں مادے کی حقیقت سے کسی قدر ہماری آگہی اس نکتہ کی عقدہ کشائی میں مدد دے سکتی ہے کہ جب ایٹم فی نفسہٖ ایک خالی مکان ہے جسے مکان کہنا بھی فہم انسانی کی رعایت سے تکلفاً ہے تو پھر مکاں کی اصل حقیقت کیا ہو سکتی ہے۔ گویا زمان و مکان کی اصل ہماری نگاہوں سے مستور ہے۔ وحی ربانی کا مجموعی تاثر اس خیال سے عبارت ہے کہ زمان و مکان کو ابدی حقیقت سمجھنے کے بجائے ہم ان کی محدودیت کا ادراک کر سکیں اور خدا کی اس کائنات کی تفہیم میں ان اصطلاحات اور ان کے متعلقات کو حائل نہ ہونے دیں۔

شعور کیا ہے؟

موت کی سرّیت ہمیشہ سے انسانوں کے لیے عقدۂ لاینحل رہی ہے۔ انسان مر کر جاتا کہاں ہے؟ انسان کی موت بھی دوسری ذی روحوں کی طرح ہے یا اس کے ساتھ کچھ خاص معاملہ ہے کہ حشر و نشر، حساب و کتاب، سزا و جزا، جنت و جہنم، دنیا و آخرت انسانوں کو ذی شعور مخلوق کا دائرۂ فکر عطا کرتے ہیں۔ اس راز کی غیر عقلی تاویلات نے انسانی تاریخ میں بڑے بڑے التباسات کو جنم دیا ہے بلکہ سچ پوچھئے تو کفر و شرک کا سارا کاروبار انسانی شعور کی تاویلاتِ باطلہ کا مرہون منت ہے۔ انسانی شعور کا انکار اور حیات دنیا کو سب کچھ سمجھ لینا اگر ایک طرف فتنہ و فساد اور ناانصافی کو جنم دیتا ہے تو دوسری طرف روح کی ابدیت کا فلسفہ، جنم در جنم کی تاویلات، مختلف اوہام و اندیشوں کا اسیر بنا دیتا ہے۔ پھر اگر یہ خیال استناد حاصل کر لے کہ روح انسانی وجود کے اندر ابدیت کا آبشار ہے جس کے حصول سے مشاہدۂ حق کا کام لیا جا سکتا ہے یا اس قوت کو جِلا دینے سے انسان اپنے آپ کو خدائی قوتوں کے ساتھ ہم آہنگ کر سکتا ہے تو اس قسم کے خیالات قبالائی تصوف، سفلی عملیات اور مشاہدۂ حق کے غیر ضروری شوق کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ گویا انسان کی نفس

ماہیت کی تاویلات باطلہ میں عام انسانوں کے لیے پراگندۂ فکری کا خاصہ سامان پایا جاتا ہے۔ پھر یہ ایک ایسا راز ہے جس کا زمان ومکان کے قیدیوں پر افشا ہونا ممکن بھی نہیں۔[۱۷]

قرآن مجید نے اس راز سے پردہ اٹھانے کے بجائے ان سوالوں کے لیے عقلی دائرۂ فکر فراہم کیا۔ البتہ اس بات کی وضاحت بھی کر دی کہ ان امور پر کوئی شافی بحث مختلف محدودیتوں کے سبب انسانوں کے لیے ممکن نہیں۔ سب سے پہلی بات تو یہ سمجھ لینے کی ہے کہ انسانوں کو دوسری ذی روحوں کے مقابلے میں یک گونہ سبقت حاصل ہے ایسا اس لیے کہ قرآنی قصۂ تمثیلِ آدم کے مطابق خدا نے انسان میں خود اپنی روح پھونک رکھی ہے۔ ﴿و نفخت فیه من روحی﴾ اس پر سے سمع و بصر اور فواد کا عطا کیا جانا مستزاد ہے (سجدہ: ۹)۔ انسانوں کا یہی وہ امتیاز ہے جس کے سبب خدا نے ملائکہ کے لیے اسے قابل سجدہ قرار دیا۔ گویا انسان کے اندر کوئی ایسی قدسی شئی، جس کی ماہیت سے ہم واقف نہیں، اللہ نے ودیعت کر رکھی ہے۔ جدید اصطلاح میں اسے ہم شعور یا consciousness کہہ سکتے ہیں۔ البتہ یہ شئی چونکہ فی نفسہٖ ایک لطیف قدسی شئی ہے جو ہمارے وجودی ابعاد سے بالاتر بھی ہے اور ہمارے وجود کا حصہ بھی، اس لیے اب تک کی تمام مساعی اس راز سے پردہ اٹھانے میں ناکام رہی ہے کہ یہ شعور یا قدسی صفتی چیز ہے کیا؟ کہاں پائی جاتی ہے؟ اور جب یہ ہمارا ساتھ چھوڑ جاتی ہے تو ہمارا جسم گوشت و پوست کا ناکارہ ڈھیر کیوں بن جاتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ جانوروں کا دماغ ہو یا انسان کا بظاہر ان کی ساخت تقریباً ایک سی ہے۔ بلکہ اگر عام انسانوں کو ان مختلف دماغوں میں فرق کرنے کے لیے کہا جائے تو شاید ان کے لیے یہ پتہ لگانا مشکل ہو کہ ان میں سے کون سا دماغ انسان کا ہے اور کون سا جانور کا۔ الّا یہ کہ سائز میں انسان کا دماغ بڑا ہوتا ہے۔ گویا بنیادی مشین (hardware) میں کچھ زیادہ فرق نہیں۔ پھر آخر کیا وجہ ہے کہ جہاں انسان میں غور و فکر، تفکر و تدبر کی بے پناہ امکانی صلاحیت موجود ہے وہیں جانور اس نعمت سے یکسر محروم ہیں۔ وحی ربانی کے طالب علم کے لیے یہ نکتہ اسے ایک ایسی دنیا سے واقف کراتا ہے جہاں انسانی شعور کا قدسی مہبط اسے راست آسمانی پیغام سے مربوط کر دیتا ہے۔ اس بات کو ذرا وضاحت سے یوں سمجھئے کہ قرآنی دائرۂ فکر میں روح، وحی اور نبوت ایک سرّی تکون سے عبارت ہے۔ انسانی شعور کا مہبط وحی ہونا دراصل اسی سبب ہے کہ وہ خدا کی عطا کردہ ایک تقدیسی شئے ہے اور اسی حوالے سے نبی کی ذات کلمۃ اللہ بن جاتی ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے انسان کے آرکی ٹائپ کی تخلیق کی تو اسے اپنی روح سے متصف کیا۔ گویا ایک ایسا قدسی صفتی شعور اس کے وجود کا حصہ بن گیا جس کے سبب دوسری تمام مخلوقات پر اسے تفوق حاصل ہو گیا۔ یہ تو رہی عام انسانوں کی بات۔ رہے انبیائے کرام جنھیں روح القدس سے مدد دی گئی تو ان کا پیغمبرانہ شعور ایک خاص جہت کا حامل ہے جو ان کے مہبط وحی ہونے کے سبب ہے۔ بنیادی طور پر یہ بھی ایک قسم کا غیر معمولی قدسی شعور ہے لیکن جس طرح ہم پہلے شعور کی بابت کچھ

نہیں جانتے اسی طرح ہم ترسیل وحی اور مہبط وحی کے شعور سے قطعی نابلد ہیں۔ ہاں قرآن ہمیں اتنا ضرور بتاتا ہے کہ روح القدس کی کرشمہ سازیاں ایک نوزائیدہ بچے کو ماں کی گود میں قادرالکلامی سے ہمکنار کرسکتی ہیں جیسا کہ حضرت عیسیٰ کے سلسلے میں ہوا۔ اور یہی شعور اگر کرشمہ سازی پر آمادہ ہو تو مٹی کے پرندوں کو پرواز پر آمادہ کردے، کوڑھ اور برص کے مریضوں کو شفا عطا کردے، مردوں میں زندگی کی جوت جگادے اور عام انسانوں کو یہ گمان ہو کہ گویا یہ سب کچھ سحر مبین ہے۔ البتہ یہ انبیائی شعور ہر خاص و عام کے تجربے کا حصہ نہیں بن سکتا۔ یہ صرف ان انبیائے مامورین کا حصہ ہے جنھیں اللہ اس کام کے لیے منتخب کرلیتا ہے۔ ﴿ینزل الملائکة بالروح من امرہ علی من یشاء من عبادہ ان انذروا انه لااله الا انا فاتقون﴾ ۔ جہاں عام انسانوں کا شعور انھیں حق و باطل میں تمیز اور تفکر و تدبر کی صلاحیت عطا کرتا ہے وہیں نبی کا شعور بسبب وحی کلمۃ اللہ سے عبارت ہے جیسا کہ عیسیٰ ابن مریم کے سلسلے میں وارد ہے کہ وہ خدا کے رسول اور اس کا کلمہ ہیں جسے اللہ نے مریم کی طرف اِلقا کیا۔ سو کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ وہ شعور قدسی کی تحمیل کے سبب الوہیت کے منصب پر فائز ہوگئے ہیں۔ گویا قرآنی بیان کے مطابق اولاً عام انسانوں کو شعور سے متصف کیا گیا جو فی نفسہٖ کوئی لطیف قدسی شئے ہے۔ ثانیاً انبیائے کرام روح الامین اور روح القدس یعنی شعور کے ابعاد مختلفہ سے متصف کئے گئے جس کے سبب ان کی ذاتِ قدسی صفات غایت وحی کی چلتی پھرتی تصویر بن گئی اور وہ عام انسانوں کے لیے اسوہ و قدوہ قرار پائے۔ ثالثاً انسانی شعور میں اخذ و اکتساب، ارتقاء و ترکیز کے بے پناہ امکانات پائے جاتے ہیں۔ وجدان، احلام اور ان کے نتیجہ میں تاویل الاحادیث کی باتیں جس کے اشارے قرآن مجید میں موجود ہیں اس بات پر دال ہیں کہ شعور ایک انتہائی نازک، حساس اور خطرناک ہتھیار ہے جو اگر امکانات کی ایک لامتناہی دنیا آباد کرسکتا ہے تو دوسری طرف اس کا صوفیانہ قالب یا مجہول علمی لب ولہجہ تحلیل نفسی کی ایک ایسی دھند پیدا کرسکتا ہے جس سے نکل آنا انسانوں کے لیے کچھ آسان نہیں۔

رہا یہ سوال کہ فی نفسہٖ یہ شعور ہے کیا؟ یہ کہاں پایا جاتا ہے۔ تو اس کی ماہیت کے سلسلے میں کوئی شافی جواب دینے کے بجائے صرف اتنا کہا گیا کہ یہ امر ربی ہے اور تمہارے پاس اس کی ماہیت کو سمجھنے کے لیے بنیادی علم موجود نہیں ﴿ویسئلونك عن الروح قل الروح من امر ربی وما اوتیتم من العلم الا قلیلا﴾ (الاسراء:۸۵)۔ ابھی تک یہ بات وثوق سے نہیں کہی جاسکی ہے کہ انسانی شعور یا consciousness کہاں واقع ہے؟ گذشتہ تیس سالوں کی تمام تحقیقات کا نچوڑ یہ ہے کہ بقول شخصے ہم انسانوں پر کم از کم اتنا تو آشکارا ہوگیا ہے کہ شعور دماغ میں پایا جاتا ہے پیر میں نہیں۔ ہمارے خیال میں اتنا کہنا بھی ایک مبالغہ سے کم نہیں۔ دماغی سائنس تو ابھی اسی بات پر حیران و پریشان ہے کہ انسانی حواس خمسہ، جو دماغ کو مہمیز کرتے ہیں اور جو ہمیں رنگ برنگی روشن کائنات کی جھلک دکھاتے ہیں، وہ فی نفسہٖ ایک

انتہائی تاریک ڈبہ ہیں جس کے اندر کیا کچھ کس طرح ہوتا ہے اس بارے میں ہمیں کچھ بھی نہیں معلوم۔ بعضے کہتے ہیں کہ ذہن (mind) و دماغ (brain) دو الگ الگ حقیقتیں ہیں۔ دماغ کو ٹھوس شکل میں دیکھنا اور اس کے خلیوں کا مطالعہ کرنا خواہ کتنا ہی ناقابل فہم عمل کیوں نہ ہو ممکن ہے جبکہ ذہن ہماری دسترس سے یکسر باہر ہے۔ ہم اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے۔ بعضے کہتے ہیں کہ ہمارے اردگرد جو کچھ ہو رہا ہے اس میں سے صرف وہی چیزیں ہمارے حیطۂ ادراک میں آتی ہیں جو ہمارے حواس خمسہ سے ٹکراتی ہیں ورنہ بے شمار سرگرمیاں حواس خمسہ کے دائرہ سے باہر ہونے کے سبب ہمارے تجربات کا حصہ نہیں بن پاتیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ سرے سے ظہور پذیر نہیں ہو رہی ہیں۔ مثلاً ابعاد ثلاثہ سے ماوراء حقائق جس طرح ہماری گرفت میں نہیں آتے، اسی طرح حواس خمسہ سے ماوراء سرگرمیاں ہمارے تجربے کا حصہ نہیں بن پاتیں۔ ہماری مجبوری یہ بھی ہے کہ ہم شعور کا مطالعہ اس خوابیدہ شعور کے ذریعہ کرنا چاہتے ہیں جس کے بارے میں عام خیال ہے کہ وہ دس سے چودہ فیصد سے زیادہ بیدار نہیں ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ انسانی وجود میں جو چیز سب سے اہم ہے اس کے جائے وقوع کے بارے میں اب تک ہمیں کچھ بھی نہیں معلوم ہو سکا ہے۔ قرآن مجید میں ﴿لھم قلوب لایفقھون بھا﴾ یا وحی کے سلسلے میں ﴿نزلہ علی قلبك﴾ جیسے بیانات کیا مہبط شعور کی طرف اشارہ کرتے ہیں یا یہ سب کچھ محض ایک ادبی پیرایۂ بیان ہے؟ ہمارے لیے اس بارے میں کچھ کہنا ابھی قبل از وقت ہے۔ یہ کیسی عجیب بات ہے کہ ہم جس گوشت پوست کے انسان کو مادی حقیقت سمجھے بیٹھے ہیں اور جس دل اور دماغ کو اعضائے رئیسہ کی حیثیت دے رکھی ہے اس کی حقیقت پر جدید سائنس نے یہ کہہ کر شبہات وارد کر دیئے ہیں کہ مادے کا سب سے چھوٹا ذرہ ایٹم اپنی ماہیت میں توانائی کی چند لہروں (energy waves) کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ یہ ایک خالی خولی مکان ہے، مکمل خلا سے عبارت۔ سو انسانی جسم کے مادی وجود کی کچھ بھی حقیقت نہیں۔ اب رہا شعور جو ہمارے وجود کا اصل الاصل ہے تو وہ بوجوہ ہمارے حیطۂ ادراک سے باہر ہے۔ گویا ان تمام مباحث کا ماحصل یہ ہے کہ ہم شعور کی سرّیت سے خوف کھانے یا التباسات و اوہام کے راستے پر چل نکلنے کے بجائے اسے ایک ناقابلِ ادراک حقیقت کے طور پر تسلیم کر لیں کہ یہی ایمان بالغیب کا مقصود و مطلوب ہے۔ اور یہی حقیقتِ نفس الامر بھی۔

آخرت: دوسری دنیا کا منظرنامہ

ایک ایسی دنیا میں جہاں ہر شئے فنا کی طرف رواں دواں ہو اور جس کا برحق ہونا ہر خاص و عام پر عیاں ہو ایک ایسا کھلا راز تھا جس سے اہل نظر خوب واقف تھے۔ فنا اور بقا کے مسائل نے ازمنۂ قدیم سے تارک الدنیا راہبوں کے

ایسے حلقوں کو جنم دیا تھا جسے روحانیت کے متوالے بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اہل یہود کا قبالائی تصوف، اہل کلیسا کی خانقاہیں اور اہل ہنود میں ترک دنیا کے ذریعہ نجات (مُکشا) کا حصول گویا اس خیال سے عبارت تھا کہ سعید نفسوں کے لیے دنیا کی بوقلمونیوں میں کچھ بھی نہیں رکھا ہے۔ ترک دنیا کا یہ رویہ جسے مذہب کا اصل الاصل سمجھ لیا گیا تھا، تسخیری اور اکتشافی ذہن کے لیے سمِ قاتل تھا جس نے انسان کو کائنات میں عضو معطل بنا کر رکھ دیا تھا۔ دوسری طرف جو لوگ دنیا کی رنگینیوں میں کھو کر کالانعام جینے کی راہ پر چل نکلے تھے اور جو ﴿ظاهراً من الحياة الدنيا﴾ کو سب کچھ سمجھ بیٹھے تھے وہ آخرت سے یکسر غافل ہو گئے تھے۔ وہ اس حقیقت کو یکسر فراموش کر بیٹھے تھے کہ ارض وسمٰوات کی موجودہ دنیا ایک مدت محدود ﴿لاجل مسمٰی﴾ کے لیے ہے۔ حتیٰ کہ ان کا یہ رویہ انھیں لقائے رب کے انکار کی راہ پر لے گیا۔[18] وحیِ ربانی نے اس افراط وتفریط کے درمیان ایک حیرت انگیز توازن پیدا کیا۔ اگر ایک طرف متاع الدنیا کو لہو ولعب اور متاع غرور قرار دیا تو دوسری طرف ﴿لاتنس نصيبك من الدنيا﴾ کی تلقین بھی کی۔ آخرت کے حسنات کے ساتھ ساتھ دنیا کے حصول کو بھی غایت دین قرار دیا۔ حتیٰ کہ دنیا اور آخرت کے الفاظ بھی قرآن مجید میں یکساں تعداد میں آئے[19] جس سے غالباً یہ بتانا مقصود ہو کہ حصول آخرت کا مطلب ترک دنیا ہرگز نہیں ہے، جیسا کہ قولِ رسولؐ ہے ان الدنيا خلقت لكم و انكم خلقتم للآخرة۔

البتہ یہ خیال کہ آخرت کی گھڑی کب آئے گی؟ دنیا کی بساط کب لپیٹی جائے گی؟ روزِ جزا کب قائم ہوگا اور اس کے حضور لوٹائے جانے کا وعدہ کب پورا ہوگا؟ تو اس راز سے پردہ اٹھانے کے بجائے صرف اس بیان پر اکتفا کیا گیا کہ ﴿علمها عند ربی فی کتاب لایضل ربی و لا ینسیٰ﴾ (طٰہٰ:۵۲)۔ اگر انسان کو اس گھڑی کا علم ہو جائے تو پھر انسانی زندگی کی تمام رمق اور تسخیر واکتشاف کا تخلیقی سفر بے معنی ہو کر رہ جائے گا۔ اور اگر یہ خیال عام ہو جائے کہ ابھی کائنات کے اتمام کو ایک مدت بے شمار وحساب باقی ہے تو نہ صرف یہ کہ کائنات کی سرّیت رخصت ہو جائے بلکہ انسان لقائے ربی کے طرب انگیز لمحات کے انتظار میں خود کو ایک لایعنی میکانیکی عمل میں گرفتار پائے۔ سورۂ فرش وعرش کا یہ کہنا ﴿لعل الساعة تكون قريبا﴾ انسانی سفر کو ایک گہری معنویت اور سرّیت سے دوچار کر دیتا ہے۔

گذشتہ صفحات میں تخلیق کائنات کے بیان میں ہم نے آیت رتق کے حوالے سے اس بات کی نشاندہی کی تھی کہ کس طرح ابتداء میں جب ارض وسماء یکجا تھے، خدا نے ایک زبردست دھماکے کے ذریعے انھیں الگ الگ تخلیق کیا۔ پھر یہ کائنات جو ہر لمحہ ارتقائی عمل سے دوچار ہے مسلسل وسیع ہوتی جا رہی ہے اس کا موجودہ صورت حال میں برقرار رہنا ایک مدت مخصوص کے لیے ہے جس کے بعد خدائی بیان کے مطابق وہ دن آئے گا جب آسمان اس طرح لپیٹ دیئے جائیں گے گویا وہ اسکرول کے اوراق ہوں اور پھر جس طرح خدا نے تخلیق کی ابتداء کی تھی اسی طرح وہ پھر اس کا اعادہ

کرے گا۔ اور اس بارے میں کسی کو شبہ نہ ہو، کہ بقول قرآن، یہ ایک ایسا وعدہ ہے جو ہمارے (خدا کے) ذمہ ہے اور یہ کام ہمیں بہر حال کرنا ہے: ﴿انا کنا فاعلین﴾ (۲۱:۱۰۴)۔ اس دن ایک عجیب منظر ہوگا، تارے اپنی چمک کھو دیں گے (۷۷:۸) ان کا حسن تنظیم غائب ہو جائے گا (۸۲:۲)۔ آسمان پگھلتے ہوئے پیتل کا منظر پیش کریں گے (۷۷:۸)، پہاڑ مثل غبار اڑتے پھریں گے اور زمین ایک چٹیل میدان بن جائے گی جس میں نہ کوئی بل ہوگا اور نہ کوئی سِلوٹ۔ اس دن سب لوگ پکارنے والے کی پکار پر لبیک کہیں گے۔ کوئی ذرا بھی سرتابی نہ کر سکے گا کہ اس دن خدا کے آگے کسی کو زبان ہلانے کی جرأت نہ ہوگی (۲۰:۱۰۶-۸)۔ اس دن لوگ منتشر پریشان حال پروانوں کی طرح ہوں گے اور پہاڑ غباروں کا منظر پیش کر رہے ہوں گے (۱۰۱:۴،۵)۔ ایسا لگے گا گویا کسی نے ارض دنیا اور اس کے پہاڑوں کو کوٹ کوٹ کر غبار بنا ڈالا ہو (۶۹:۱۴)، جن کی اصل حقیقت غبار منتشر کے علاوہ کچھ بھی نہ ہو (۶۸:۶)۔ وہ دن جب صاف محسوس ہوگا کہ آسمان پھٹ گیا ہو، تارے بکھر گئے ہوں اور سمندر بے قابو ہو گئے ہوں (۸۲:۱-۳)۔ دراصل اس کائنات کی ایک منطقی منزل ہے کہ کائنات کی ہر شئے دراصل اس اختتام کی طرف رواں دواں ہے جس کے بعد ایک نئی دنیا کی تعمیر کا وعدہ ہے۔ رہا یہ سوال کہ وہ آخری لمحہ کب آئے گا تو اس بارے میں اکتشافی ذہن کے لیے رمز و کنایہ میں محض اشاروں پر اکتفا کیا گیا کہ آخری لمحہ کی سرّیت کو بہر حال باقی رکھا جانا مقصود تھا کہ پوچھنے والا جب وفورِ اشتیاق کی تاب نہ لا کر پوچھ بیٹھا کہ آخر کب آئے گا وہ قیامت کا دن تو فرمایا کہ جب آنکھوں میں دیکھنے کی تاب نہ ہوگی اور چاند اپنی روشنی کھو دے گا اور سورج اور چاند باہم ملا دیئے جائیں گے (۷۵:۶-۹)۔ ایسا اس لیے کہ اس دن سورج جو رواں دواں اپنی منزل کی طرف مسلسل بڑھ رہا ہے اپنا سفر پورا کر لے گا۔ ﴿والشمس تجری لمستقر لها﴾ کہ یہی ﴿تقدیر العزیز العلیم﴾ یعنی خدائی منصوبہ ہے (۳۶:۳۸)۔

ان قرآنی بیانات سے مجموعی طور پر یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ اولاً کائنات جو عدم سے وجود میں لائی گئی اور جو فی زمانہ مسلسل ارتقاء کے مراحل سے دوچار ہے تو یہ صورت حال دائمی نہیں۔ ثانیاً خدائی اسکیم کے مطابق اس کائنات کو فنا کے عمل سے دوچار ہونا ہے جس کے بعد ایک نئی تخلیق اور ایک نئی زندگی کی بشارت ہے جس کے حقیقی ابعاد سے ہم واقف نہیں۔ ہاں اتنا ضرور جانتے ہیں کہ نئی تخلیق ایک ایسے عالم سے عبارت ہوگی جہاں اہل ایمان لقائے ربی کے شرف سے نوازے جائیں گے۔ ثالثاً کائنات جو عدم سے وجود میں لائی گئی ہے جو عمل رتق کے بعد مسلسل وسعت وارتقاء ﴿لموسعون﴾ کے عمل سے دوچار ہے وہ بالآخر عدم کے ہالے میں غائب ہو جائے گی جہاں سے ایک نئی تخلیق اور نئی دنیا کا سفر شروع ہوگا۔ رابعاً اگر انسان کے پاس چشم بینا اور اکتشافی ذہن ہو تو وہ اس بات کا اندازہ کر سکتا ہے کہ سورج جو اپنے مستقر کی طرف گامزن ہے اور جس کی حدت اور روشنی سے نظامِ شمسی کی بوقلمونی قائم ہے رفتہ رفتہ جب اس کی

حرارت ماند پڑ جائے گی تو اس کے نتیجے میں نہ صرف یہ کہ چاند بے نور ہو جائے گا، تارے اپنی چمک دمک کھو دیں گے بلکہ اس بجھتے سورج کے سبب انسانی زندگی کے امکانات بھی معدوم ہو جائیں گے۔ یہی ہے وہ منظر نامہ جب انسان پکار اٹھے گا۔ کہاں ہے جائے پناہ، ﴿این المفر﴾؟ (۷۵:۱۰)۔ تو کیا سورج کے اس سفر کے پیش نظر یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ انسان اپنی تاریخ کے وسط میں ہے اور وہ لمحہ، وہ آخری ساعۃ ابھی ہم سے بہت دور ہے۔ سائنس ہو یا مذہب ہر جگہ اس سوال کے حتمی جواب کی تلاش میں انسانوں نے قیاس کے گھوڑے دوڑائے ہیں۔ اگر ایک طرف بائبل کوڈ کے متلاشیوں نے اپنے اعداد و شمار کی بنیاد پر قیامت کی گھڑی متعین کرنے کی کوشش کی ہے[۲۰] تو دوسری طرف اہل سائنس نے محض قیاس کی بنیاد پر قیامت کے امکان کو تاریخ بُعدِ بعید کا حصہ بتایا[۲۱] اور اس رجحان سے تحریک پا کر بعض مسلم علماء نے بھی حروف مقطعات کے ذریعے اس سرّ الاسرار کی عقدہ کشائی کا دعویٰ کر دیا[۲۲] لیکن واقعہ یہ ہے کہ آج بھی ﴿لعل الساعۃ تکون قریبا﴾ کی خدائی تنبیہ کی سرّیت اسی طرح باقی ہے۔ اور سچ تو یہی ہے کہ ﴿علمھا عند ربی فی کتاب﴾۔

کہا جاتا ہے کہ کائنات جو بے شمار کہکشاؤں کی آماجگاہ ہے یہاں کہکشائیں ایک دوسرے سے مسلسل دور ہو رہی ہیں جس کے سبب کائنات وسیع تر ہوتی جا رہی ہے۔ کائنات کی یہ وسعت جب اپنی انتہا کو پہنچے گی تو پھر اس کے سکڑنے کا عمل شروع ہوگا اور اگر ایسا ہوا تو بالآخر پوری کائنات سکڑ کر ایک ذرہ بلکہ ذرہ سے بھی حقیر وجود میں تحلیل ہو جائے گی۔ یہ وہی منظر نامہ ہے جسے قرآن میں ﴿یوم نطوی السماء کطی السجل للکتب﴾ (۲۱:۱۰۴) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ بعضے کہتے ہیں کہ دنیا کے لپیٹ دیئے جانے کا یہ عمل کشش ثقل کے سبب ہوگا کہ جب کائنات اپنی وسعت کی انتہا کو جا پہنچے گی تو پھر غیر معمولی وسعت کے سبب کشش ثقل کا موجودہ اصول کام نہ کرے گا۔ ایک امکان یہ ہے کہ کہکشاں باہم ایک دوسرے سے قریب آنے لگیں اور اچانک ان کے قریب آنے کی رفتار ایسی خطرناک شدت اختیار کر لے کہ آناً فاناً ایک دوسرے میں تحلیل ہو کر نقطۂ تاریک میں غائب ہو جائیں۔ دوسرا امکان یہ بھی ہے کہ کائنات کی سرحدوں سے ٹکرا کر کہکشائیں دوبارہ ارتکاز کی طرف گامزن ہوں۔ اگر ایسا ہوا تو اس کا بھی جمع حاصل بالآخر تحلیل و غیاب پر ہی منتج ہوگا۔ بعضوں نے یہ قیاس آرائی بھی کی ہے کہ ہماری دودھیائی کہکشاں سے قریب ترین جو دوسری کہکشاں اینڈرومیڈا ہے وہ مسلسل ہماری طرف بڑھ رہی ہے، قیاس ہے کہ کوئی تین بلین سالوں کے بعد یہ ہماری کہکشاں سے آٹکرائے گی اور اس طرح ہماری زمین کا خاتمہ ہو جائے گا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس تمام بظاہر سائنسی گفتگو کی حقیقت محض قیاس آرائیوں کی ہے کہ کائنات کے سلسلے میں ہمارا علم ابھی بالکل ابتدائی مرحلے میں ہے۔ ہم ابھی نہ تو اس کی وسعت سے آگاہ ہوئے ہیں اور نہ ہی ہمیں یہ پتہ ہے کہ اس کائنات کی کوئی سرحد ہے بھی یا نہیں، اور اگر ہے تو اس کی سرحد کے آگے کیا

ہے۔ ہمارے لیے تو ابھی ابعادِ ثلاثہ کی دنیا سے نکل کر ابعادِ مختلفہ کی دنیا میں قدم ڈالنا بھی ممکن نہیں ہو پایا ہے، پھر ہم یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ ہم کائنات کے تاریخی سفر میں ابتداء میں ہیں یا درمیان میں۔ بظاہر یہ التباس ہوسکتا ہے کہ سورج کو بے نور ہونے میں ابھی عرصہ درکار ہے کہ ابھی اس کی انرجی کا وافر حصہ باقی ہے البتہ جس طرح ہم سکڑتی کائنات کو ایک نسبتاً سست عمل متصور کرتے ہیں اور پھر برق رفتاری سے کہکشاؤں کے ارتکاز اور آناً فاناً اس کے غیاب کے قائل ہیں کیا عجب کہ اس کائنات میں اس آناً فاناً کا پوشیدہ میکانزم موجود ہو جو ہمیں دفعتاً آ لے۔ انسانی ذہن نے جب کبھی بھی اس لمحے کے تعین کی کوشش کی ہے اس کا نتیجہ التباسِ فکر و عمل کی شکل میں ظاہر ہوا ہے۔ نہ صرف یہ کہ علماء بائبل کی قیامت کی پیشن گوئیاں رائگاں جاتی رہی ہیں بلکہ بسا اوقات روحانیت کے متلاشیوں کے لیے یہ قیاس آرائیاں اجتماعی خودکشی کا سبب بھی بنتی رہی ہیں[۲۳] اکیسویں صدی کی ابتداء میں عالم عیسائیت میں جو ہذیانی کیفیت پائی جاتی تھی[۲۴] یا آج جو لوگ میان کلنڈر کے حوالے سے ۲۰۱۲ء میں دنیا کے خاتمے کا انتظار کر رہے ہیں[۲۵] یا جو لوگ کائنات کی مفروضہ عمر کے اعداد وشمار کی بنیاد پر اس لمحے کو تاریخِ بُعد بعید کا حصہ بتاتے ہیں یہ سب کے سب دراصل قیاس آرائیوں کے شکار ہیں۔ ان کی بنیادیں سائنسی اور اکتشافی ذہن کے بجائے سائنٹالوجی اور توہمات میں پیوستہ ہیں۔

اکتشافی ذہن کی تشکیل

نئے مسلم ذہن کی بنیاد نہ تو محض عقل پر رکھی گئی اور نہ ہی اسے کسی اساطیری طرزِ فکر کا خوگر بنایا گیا بلکہ سچ پوچھیے تو عقل کے ہاتھ میں وحی کی کتاب سر تھما دی گئی۔ اس طرح وحی ربانی کے جلو میں مطالعۂ فطرت کے ذریعے علم و آگہی کا ایک نیا علم وجود میں آ گیا۔ وحی کا سرّ یا رازِ کائنات کے منکشف ہو جانے سے پہلی نسل کے مسلمان غیر معمولی اعتماد سے سرشار نظر آئے۔ انھیں فی الواقع ایسا محسوس ہوا گویا قرآن مجید نے مستقبل کی کمان ان کے ہاتھوں میں تھما دی ہو۔ اور یہ کہ وہ غیاب پیمبر میں بھی بتمامِ کمال مستقبل کے انسانی قافلے کی منزل نوائی کے اہل ہیں۔

نئے دائرۂ فکر کی بنیاد وحی، انفس اور آفاق کے ارکان ثلاثہ پر رکھی گئی۔ اس تکون سے محض سِرّیت کے حجاب کو چاک کرنا مقصود نہ تھا بلکہ انسان کو اس مہیب کائنات میں اپنے مقام سے آگاہ کرنا تھا اور یہ بتانا بھی کہ کائنات کا بھید یکسر ناقابل فہم نہیں۔ قرآنی ذہن کے ابعاد نرے سائنسی طرزِ فکر میں متشکل نہیں ہو سکتے۔ آنکھیں جو کچھ دیکھتی ہیں وہ اشیاء کی ماہیت کا محض ایک ڈائمنشن ہے، سو جہاں انسان کا مشاہدہ اس کا ساتھ نہ دے سکے وہاں حقیقتِ نفس الامر کی تلاش کے لیے وحی ربّانی کے اشارات ہماری دستگیری کر سکتے ہیں۔ لیکن کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ ہم حقیقتِ نفس الامر کا

تمام تر ابعاد کے ساتھ ادراک کر سکتے ہیں کہ ابعاد اربعہ کے حاملین کے لیے ان ابعاد سے ماوراء حقائق کا حصول ممکن نہیں۔ ہاں ہم اتنا ضرور کر سکتے ہیں کہ آیاتِ کائنات میں ان عظیم تخلیقی استعاروں کو پڑھ سکیں جو عقل محض کے حاملین کے لیے بالعموم ممکن نہیں۔ رہے وہ لوگ جو کائنات کی مہیب وسعت پر غور وفکر سے عاجز ہیں اور جن کا چشم تصور اور وجدان کائنات میں ہر لمحہ برپا معرکۂ ﴿کن فیکون﴾ سے نا آگاہ ہے تو یہ دراصل وہ لوگ ہیں جن کے پاس قلوب ہیں لیکن فہم سے خالی، آنکھیں ہیں مگر بصیرت سے خالی، کان ہیں مگر سماعت سے محروم۔ یہ لوگ دراصل چوپایوں کی مانند ہیں بلکہ اس سے بھی گئے گزرے ﴿اولئك هم الغافلون﴾ (اعراف:۱۷۹)۔ وحی ربانی نے ہانکے پکارے قلب ونظر کے استعمال کی دعوت دی اور اس فریضہ میں کوتاہی برتنے والوں کو دردناک انجام سے متنبہ کیا: ﴿والذين سعوا في آياتنا معجزين اولئك اصحاب الجحيم﴾ (حج:۵۱)۔ ایسا اس لیے بھی کہ کائنات کے اسرار ورموز سے منہ موڑ کر زندگی جینے والوں کو دنیا ایک تنگ وتاریک گھاٹی کی شکل میں نظر آتی ہے۔ آیات اللہ کی تفہیم سے دور ہونا گویا تسخیری اور اکتشافی صلاحیتوں سے محروم ہو جانا ہے۔ جو قوم اس صریح کافرانہ رویّے کو اپنا شعار بنالیتی ہے اسے دنیا میں ذلت کا عذاب تو جھیلنا ہی پڑتا ہے آخرت میں بھی کم سوادی اس کا مقدر بن جاتی ہے ﴿ومن كان في هذه اعمىٰ فهو في الآخرة اعمىٰ﴾۔

نئے مسلم ذہن کے لیے کائنات اب کوئی عقدۂ لاینحل نہیں بلکہ ایک انتہائی پیچیدہ اور منصوبہ بند تخلیقی عمل سے عبارت تھا۔ وحی ربانی خاص طور پر اولو الالباب یا اولو النهی کو خطاب کرتی جنھیں انفس وآفاق میں آیاتِ ربی کی جلوہ سامانیوں کا مشاہدہ کرنا تھا۔ ينظرون، يتفكرون، يسمعون، يتدبّرون، يتذكرون، يعقلون، يفقهون، يعلمون اور ان جیسے ہم معنیٰ الفاظ کی تکرار اور اس عمل پر اصرار نے اس بات کو یقینی بنایا کہ اب انسانی معاشرے میں وجدنا آبائنا كذالك يفعلون کی بند دماغی پر ہمیشہ کے لیے مُہر استرداد لگ جائے۔ نئے دائرۂ فکر میں عقل چونکہ وحی کی ضد نہیں بلکہ اس کی معاون ومشیر تھی اور رہنما بھی، سو بشارت دی گئی کہ جوں جوں عقل ترقی کرتی جائے گی وحی کا منجانب اللہ ہونا اور اس کی صداقت پر یقین واثق ہوتا جائے گا: ﴿سنريهم آياتنا في الآفاق وفي انفسهم.... الخ﴾ (فصلت:۵۳) اس آیت میں مستقبل کا صیغہ اس بات کا صریح اشارہ ہے کہ عقل کے ذریعہ خدا کی آیات کی عقدہ کشائی ماضی اور حال سے کہیں زیادہ مستقبل میں ہوگی۔ آج جو چیزیں اہل مشاہدہ کے لیے محض اپنی آنکھوں سے دیکھنا ممکن نہیں کیا عجب آنے والے دنوں میں مشاہدہ کے نئے وسائل اسے ممکن بنادیں۔ قرآن مجید کا نزول گویا اس بات کا اعلان تھا کہ اب غور وفکر کا وہ انقلابی منہج انسانوں کی دسترس میں ہے جس کا برتنا ان کے لیے اگر ایک طرف ایک عقلی رویّے کی تشکیل میں مہمیز ہوسکتا ہے تو دوسری طرف خود اس کتاب کے برحق ہونے پر ان کے ایقان میں اضافے کا سبب

بھی، جیسا کہ ارشاد ہے: ﴿کتٰب انزلنٰہ الیك مبٰرك لیدبروا آیٰتہٖ ولیتذکر اولو الالباب﴾ (ص:۲۹)۔

سبعا من المثانی والقرآنِ العظیم: تاریخ کا قرآنی دور

وحی محمدیؐ سے قبل آسمانی کتابوں کا لب ولہجہ کتابِ احکام کا ہوتا تھا؛ مثلاً توراۃ جس کے معنیٰ قوانین کے ہیں، احکامِ شریعت کا مجموعہ تھا جہاں انسانوں کو اوامر ونواہی سے باخبر کر دیا گیا تھا۔ البتہ نئی وحی محض احکام وفرامین کے بجائے دعوتِ غور وفکر سے عبارت تھی۔ وہ اس بات کا برملا اعلان کرتی کہ اب چونکہ کوئی نبی نہ آئے گا اس لیے غیاب نبوی میں وحی ربانی کی روشنی میں انسانیت کے قافلے کو اپنا سفر طے کرنا ہے۔ یہی آخری نبی اور آخری کتاب کا وجہِ جواز ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خود قرآن کہتا ہے ﴿لقد آتیناك سبعا من المثانی والقرآن العظیم﴾۔ گویا اسفار موسوی کی پانچویں کتاب، المثانی (Deutronomy) سے سات اصولی احکام تو متبعین محمدؐ کے لیے برقرار رکھے گئے ہیں البتہ انھیں احکام سبعہ کے علاوہ قرآن جیسی کتابِ اکتشاف سے بھی نوازا گیا ہے جو آخری نبی کے بعد اس کے غیاب میں ﴿حجۃ بعد الرسل﴾ کی حیثیت سے انسانوں کی رہنمائی کرتی رہے گی۔ یہ بات بھی نگاہوں سے اوجھل نہ ہو کہ موسوی احکامِ عشر سے سات احکامات کی برقراری اس بات کا اعلان ہے کہ بعض احکام آفاقی ہوتے ہیں اور بعض مقامی حالات کے تابع۔ احکامِ سبعہ کی حیثیت ان بنیادی اصولوں کی ہے جن پر کسی ربانی معاشرے کی تعمیر ہو سکتی ہے۔ البتہ مستقبل کا انسانی معاشرہ جسے نبی کے غیاب میں اپنا کام انجام دینا ہے محض احکامِ عشر یا احکامِ سبعہ کی فقہی تعبیر سے اپنا سفر طے نہیں کر سکتا کہ آنے والے دنوں میں قرآن عظیم جو محکمات میں سے ہے ﴿یسین والقرآن الحکیم﴾، کتاب فطرت کی کلید کے طور پر انسانی قافلے کی رہنمائی کرتا رہے گا۔ قرآن مجید میں آیات محکمات بھی ہیں اور آیات متشابہات بھی ﴿منہ آیات محکمات ھن ام الکتاب واخر متشابہات﴾ (آل عمران:۷)۔ محکمات کی حیثیت غایت وحی کی ہے جس سے اس کتاب کی مرکزی دعوت عبارت ہے اور جس کی تفہیم کے لیے قرآن مجید کبھی تمثیلی، کبھی بیانیہ، کبھی اساطیری اور کبھی اشارۂ فطرت کا اسلوب اختیار کرتا ہے۔ گویا سرّ کائنات کی نقاب کشائی کے لیے آیات محکمات کی حیثیت مدارِ کتاب کی ہے۔ رہے وہ حقائق جن کا بیان انسانی زبان کی تنگ دامانی اور اس کے حس ادراک کی کم مائیگی کے سبب تشنگی کا احساس دلاتا ہے تو ان کے بارے میں بے سروپا تاویلات سے اجتناب کرنا ہی بہتر ہے۔ کیا عجب کہ آنے والے دنوں میں جب کائنات کے سلسلے میں ہماری معلومات میں خاطر خواہ اضافہ ہو جائے تو ہم ان حقائق کو کسی حد تک سمجھ سکیں۔ متشابہات کی تفہیم کا راستہ بھی محکمات سے ہو کر گزرتا ہے۔ سو سچے اہل علم کا رویّہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی کم

مائیگی کا اعتراف کرتے ہوئے پکار اُٹھتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے اس پر، ﴿کل من عند ربنا﴾ دراصل ایسے ہی لوگ مداروحی کو سمجھنے کے حقیقی اہل ہیں ﴿وما یذکر الا اولو الالباب﴾۔

قرآنی دائرۂ فکر اور الکتاب

ایک مختصر سی تمہیدی دعا کے بعد قرآن مجید کی ابتداء کتاب فطرت پر غور وفکر کی دعوت سے ہوتی ہے۔ قرآن اس بات کی ضمانت دیتا ہے کہ جو کوئی بھی خالی الذہن ہو کر صدق دلی سے کتاب فطرت کا مطالعہ کرے گا ہدایت اس کے حصے میں آئے گی کہ ہدایت تو ہے ہی متقیوں کے لیے۔ یہ متقی بے سوچے سمجھے اندھے عقائد پر ایمان لانے والے نہیں بلکہ آیات کائنات کے گہرے شعور سے متصف ہوتے ہیں۔ یہ لوگ غیر مرئی حقائق پر ایمان لاتے، صلوٰۃ قائم کرتے اور جو کچھ خدا نے انھیں دے رکھا اس میں سے خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جنھیں قرآن ﴿اولئك هم المفلحون﴾ سے خطاب کرتا ہے۔ ان ابتدائی آیات کے بعد آگے جو کچھ بھی ہے اس کی حیثیت دراصل کتاب فطرت کی کلید کی ہے۔ البتہ قرآن کو محض سائنسی اشاروں کی کتاب سمجھنا اس کی واقعی حیثیت کا صحیح تعین نہیں کہ قرآن مجید کی منزل تسخیر واکتشاف سے کہیں آگے اس لازوال مسرت کا حصول ہے جس کا صحیح اندازہ ابدیتِ بلا حدود میں داخلے کے بغیر نہیں کیا جا سکتا اور جسے قرآن لقائے ربی کے مسرت انگیز امکان سے تعبیر کرتا ہے۔ البتہ علم الکتاب میں ہماری دسترس یا اسرار فطرت سے آگہی ہمیں انسان، خدا، کائنات اور ان جیسے بے شمار اسرار ورموز کو سمجھنے میں مدد دے سکتی ہے۔ قوانین فطرت سے آگہی اور اس کی تسخیر عام انسان کے لیے بھی اسی طرح ممکن ہے جس طرح دربار سلیمان میں علم الکتاب رکھنے والے اس شخص کے لیے تھی جس نے چشم زدن میں طئی الارض یا (telepotation) کے ذریعہ ملکہ سبا کا تخت آنِ واحد میں حاضر کر دکھایا تھا۔ بحث کو سمیٹتے ہوئے مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ نیچرل سائنس یا علم الکتاب ایک ایسے عقلی رویے کا منطقی نتیجہ ہے جو کائنات کو خدا کی عظیم نشانیوں کے طور پر دیکھتا اور اسے کمال شکر واحتیاط کے ساتھ برتنے کا خود کو سزاوار سمجھتا ہے، اور جو اس نکتہ سے بھی ناآگاہ نہیں کہ ؎

اسی روز شب میں الجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

قرآن مجید صرف اوامر اور نواہی کی کتاب نہیں بلکہ بنیادی طور پر انسانی ذہن کو خود اعتمادی اور خدا اعتمادی سے متصف کرنے والی ایک ایسی شاہِ کلید ہے جس سے امکانات کے تمام دروازے کھل سکتے ہیں۔ قرآن مجید کا طالب علم

جب ان آیات سے گزرتا ہے ﴿وسخر لکم مافی السموات ومافی الارض جمیعا منه ان فی ذالك لآیات لقوم یتفکرون﴾ (الجاثیہ:۱۳) یا ﴿سخر لکم الشمس والقمر دائبین﴾ (ابراہیم:۳۳) یا ﴿انا جعلنا ماعلی الارض زینة لها لنبلوهم ایهم احسن عملا﴾ (کہف:۷) تو وہ ایسے اعتماد سے سرشار ہوتا ہے جس کا حال چھپائے نہیں چھپتا۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں قرآن کہتا ہے ﴿الذین یذکرون الله قیاما وقعودا وعلی جنوبهم ویتفکرون فی خلق السماوات والارض ربنا ماخلقت هذا باطلا سبحانك فقنا عذاب النار﴾ (آل عمران:۱۹۱)۔ بلاشبہ آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں، رات اور دن کے آنے جانے میں اور ان جہازوں میں جن کی سمندر میں روانی انسانوں کی منفعت کے لیے ہے اور اس بارش میں جو اللہ آسمان سے نازل کرتا ہے جس سے مردہ زمین میں جان پڑ جاتی ہے اور مختلف قسم کے حیوانات میں جو زمین میں پھیلے ہوئے ہیں اور ہواؤں کی تبدیلی اور ابر میں جو زمین وآسمان کے مابین مسخر کئے گئے ہیں دراصل ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو عقل رکھتے ہیں (البقرہ:۱۶۴)۔ ارض وسماوات اور ما بینهما پر غور وفکر کی دعوت دراصل سرالاسرار سے آگہی کا ایک وسیلہ ہے۔ انسان اگر اپنی آنکھیں کھلی رکھے اور دل ودماغ تعصّبات سے آلودہ نہ ہوں تو قرآن مجید کی دعوت غیاب محمدیؐ میں بھی انسانیت کی رہنمائی کے لیے کفایت کرتی رہے گی۔ ایسا اس لیے کہ آخری پیغمبر کے بعد بھی انفس وآفاق میں پھیلی خدا کی نشانیاں سلیم الطبع قلوب سے یہ کہتی رہیں گی:

> کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ آسمان سے پانی برساتا ہے اور پھر اس سے رنگ برنگے پھل پیدا ہوتے ہیں اور پہاڑوں کی وہ دھاریاں جو سفید، سرخ اور سیاہ کے مختلف آمیزے ہوتے ہیں اسی طرح انسانوں اور جانوروں اور مویشیوں کے رنگ بھی مختلف ہوتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اللہ کے بندوں میں صرف اہل علم ہی اس سے خشیت کرتے ہیں (فاطر:۲۸،۲۷)

انفس وآفاق پر غور وفکر کی یہ دعوت ایک ایسے وحی آمیز عقلی رویے سے عبارت ہے جس سے غیاب پیمبری میں رہتی دنیا تک رشد وہدایت کا کام لیا جاتا رہے گا۔

اکتشافی علوم کا ارتقاء

وحی ربانی نے کتاب فطرت پر غور وفکر کی ریت کیا قائم کی، اس طرز فکر نے بہت جلد مسلم ذہن کو تحلیل وتجزیے اور تسخیر واکتشاف کی راہ پر ڈال دیا۔ اب تک استخراجی منہج (deductive) کو انسانی علوم کی معراج سمجھا جاتا تھا۔ قرآن مجید نے تجربے اور مشاہدے کو بنیادی اہمیت دی اور اس طرح علم کا منہج بڑی حد تک استقرائی (inductive) ہو گیا۔ غور

وفکر کے سانچے میں یہ فی نفسہٖ اتنی بڑی تبدیلی تھی جس نے بہت جلد انسانی تہذیب کی ہیئت بدل کر رکھ دی۔ دینِ مبین کی فطری اٹھان جن خطوط پر ہوئی تھی اس کے سبب متبعین محمدؐ کے لیے ممکن نہ تھا کہ وہ کتابِ فطرت سے آنکھیں بند کر پاتے۔ روزِ اول سے متبعین محمدؐ اس بات سے آگاہ تھے کہ کعبۂ مشرّفہ صرف ان کا قبلۂ نماز ہی نہیں بلکہ وحدتِ ملی کا علامیہ بھی ہے۔ سو یہ سوال اہمیت اختیار کر گیا کہ مختلف بلاد وامصار میں تعینِ قبلہ کے لیے صحیح طریقۂ کار کیا ہو؟ فلکیات کا گہرا علم بالکل اولین مرحلے میں مسلمانوں کی دینی ضرورت بن گیا۔ پھر یہ کہ مختلف بلاد وامصار میں نمازوں کے نظام الاوقات کا تعین جغرافیہ کی وسیع معلومات اور فنِ نقشہ نگاری میں مہارت کے بغیر ممکن نہ تھا۔ قرآن مجید میں شمس وقمر کی گردش جن مقاصد کے تابع بنائی گئی ان میں ایک مقصد ﴿لتعلموا عدد السنین و الحساب﴾ بھی تھا (یونس:۵)۔ گویا متبعین محمدؐ مذہبی طور پر اس بات کے مکلّف بنائے گئے کہ وہ شمس وقمر کی اس گردش سے اپنے تقویمِ عمل کی ترتیب میں مدد لیں۔ اس پس منظر میں نماز پنجگانہ کے اوقات کی تحدید، سمتِ قبلہ کا تعین اور صومِ رمضان کے لیے قمری کلینڈر کی ترتیب، یہ ایسے عملی اور فوری مسائل تھے جنھوں نے مسلمانوں کو فی الفور مشاہدۂ کائنات کی طرف متوجہ کیا۔

وحدتِ قبلہ کا تقاضہ تھا کہ تمام دنیا کے مسلمان خواہ وہ کسی بھی خطۂ ارضی میں رہتے ہوں پنج وقتہ نمازوں میں اپنا رخ کعبہ مشرفہ کی طرف کریں لیکن مسئلہ یہ تھا کہ دور دراز علاقوں سے تعینِ قبلہ کی گتھی کیسے سلجھائی جائے؟ ابتدائی ایام میں کبھی ستاروں کی مدد سے سمتِ قبلہ کے تعین کی کوشش کی گئی تو کبھی طلوع آفتاب سے اس کا اندازہ لگانے کی کوشش ہوئی۔ بعض علمائے فلکیات بڑے دقیق مطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ کعبہ کو مرکز مان کر مختلف بلاد وامصار کو بارہ جغرافیائی خانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔[۲۶] لیکن یہ سارے تخمینے قطعیت کے احساس سے خالی تھے۔ مسلمان جب فقہی اختلاف کے گرداب میں پھنس گئے تو اختلافِ قبلہ نے ایک مسلسل نزاع کی حیثیت اختیار کر لی۔ کوئی کہتا کہ رسول اللہ جب مکہ سے مدینہ آئے تھے تو انھوں نے جنوب کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی تھی اسی سنت پر اسپین اور وسط ایشیا کے ابتدائی مسلمانوں نے بھی عمل کیا تھا سو ہمیں چاہئے کہ تعینِ قبلہ کی موشگافیوں میں پڑنے کے بجائے دور دراز علاقوں میں ہم جنوب کی طرف رخ کر کے نماز پڑھا کریں۔ کوئی اس موقف کو خلافِ عقل بتاتا کہ جب رسول اللہ نے مدینہ میں جنوب کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی تھی تب مکہ واقعتاً جنوب میں واقع تھا سو اس سنت کو تعینِ قبلہ کے لیے دلیل نہیں بنایا جا سکتا۔ کوئی کہتا کہ حج کے لیے کارواں جس سمت کو جاتے ہیں اسے ہی سمتِ قبلہ سمجھا جانا چاہئے، تو کوئی کہتا کہ ان علاقوں کی پرانی مسجدیں جس رخ پر بنی ہیں وہی ہمارے لیے کافی ہیں، تو بعض اس خیال کی پرزور حمایت کرتے کہ علوم فلکیات کے ماہرین نے جو تحقیقات کی ہیں اس سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوا کہ روایتی اور غیر روایتی فہم کے ٹکراؤ نے ایک ہی مسجد میں دو قبلوں کی طرح ڈال دی۔[۲۷] صورتِ حال کی اس نزاکت نے علمائے فلکیات کو اس

مسئلہ کا قطعی حل نکالنے پر مجبور کیا۔ تحقیق و تالیف کا سلسلہ مسلسل جاری رہا یہاں تک کہ البیرونی کی شہرہ آفاق کتاب تحدید الاماکن نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس مسئلہ کو فیصل کر دیا۔[۲۸] اس نے Spherical Trigonometry کی مدد سے افغانستان کے ایک شہر سے تعین قبلہ کی کامیاب کوشش کی[۲۹] اور پھر ان اصولوں پر کسی بھی جگہ سے سمت قبلہ کا تعین دشوار نہ رہا۔

عہد رسولؐ میں جب حضرت بلال کو اذان کی ذمہ داری تفویض کی گئی تھی تو اس کی وجہ ان کی آواز کی بلند آہنگی اور لہجہ کی وجد آفرینی تھی۔ بعد کے دنوں میں بالخصوص دور دراز کے بلاد و امصار میں مؤذن کے تقرر کے لیے یہ بھی دیکھا جانے لگا کہ وہ اوقات نماز کا صحیح فہم رکھتا ہو، اسے گردش قمر کے مختلف منازل کا علم ہو تا کہ وہ رات کی تاریکی میں بھی وقت کا صحیح اندازہ لگا سکے۔[۳۰] رفتہ رفتہ یہ مؤذن اپنے کارِ منصبی میں اس حد تک ترقی کر گئے کہ انھوں نے اوقات کے تعین کے لیے astronomical instruments ایجاد کر ڈالے۔ علم التقویم پر کتابیں تصنیف کیں اور مختلف شہروں کے لیے الگ الگ اوقات صلوٰۃ کی جدولیں تیار کر ڈالیں۔[۳۱] سمت قبلہ کے تعین اور تحدید اوقات صلوٰۃ کی ضرورتوں نے علم المیقات کے نام سے ایک نئی فلکیاتی سائنس کو جنم دیا۔[۳۲] آج ہماری مسجدوں میں اوقاتِ صلوٰۃ کا جو چارٹ ماضی کی علامت کے طور پر لٹکا دکھائی دیتا ہے اس کی جڑیں اسی علم المیقات میں پائی جاتی ہیں۔ تب ایٹومک گھڑیوں کا رواج نہ تھا اور تحدید وقت انتہائی پیچیدہ[۳۳] علم تھا جس میں ذرا سی بے احتیاطی حساب کتاب کے سارے گوشوارے الٹ کر رکھ دیتی تھی۔ اگر فلکیات بنیادی دینی ضرورت نہ ہوتی اور مسلمان اس کام کو فرض عین کی حیثیت سے انجام نہ دیتے تو شاید جدید دنیا جیسی کہ وہ آج ہے وجود میں نہ آتی۔

الخوارزمی نے جب اپنی مشہور زمانہ کتاب الجبر و المقابلہ تصنیف کی تو اس کے پیش نظر بھی ایک فرض عین کی ادائیگی تھی۔ آیت وراثت کے اطلاقی پہلو بعض اوقات بڑی دقیق پیچیدگیوں کو جنم دیتے جن کے حل کی مروجہ ریاضی میں تاب نہ تھی۔[۳۴] کہا جاتا ہے کہ خود خلیفۂ وقت نے اس سے یہ درخواست کی تھی کہ وہ تقسیم وراثت کی گتھیوں کو سلجھانے کے لیے ایک ایسی کتاب مرتب کرے جس سے اس پیچیدہ مسئلہ کو منصفانہ انداز سے حل کیا جا سکے۔ خوارزمی نے اپنی اس کتاب کے ابتدائیے میں اس امید کا اظہار کیا ہے کہ اس کتاب کی تصنیف سے وراثت کی تقسیم حتیٰ کہ زمینوں کی پیمائش، نہروں کی کھدائی اور اس قسم کے دیگر امور میں جیومیٹرائی تقویم کا کام آسان ہو جائے گا اور خدا اسے اس محنت کے عوض بہترین صلہ عطا کرے گا۔[۳۵] کچھ اسی جذبے کا اظہار البتانی نے کتاب الزیج الصابی کے ابتدائیہ میں کیا ہے۔ بقول البتانی: فلکیات کا علم تمام علوم میں ممتاز ہے جس سے روح کو بالیدگی، دل کو خوشی اور عقل کو جلا ملتی ہے، غور و فکر کی صلاحیت میں اضافہ ہوتا ہے۔ روز و شب کی گردش، شمس و قمر کے بدلتے مقامات اور ان کا گہن اور اپنے اپنے مدار میں

ان کا مستقل محوِ سفر رہنا انسانی ذہن کو خدا کی وحدانیت، اس کی عظمت، حکمت اور جلال و جبرت کا احساس دلاتا ہے۔[۳۶]

ظہورِ اسلام کے بعد جو لوگ تسخیر و اکتشاف کی ایک نئی دنیا کے قیام کے لیے سرگرداں رہے وہ سب کے سب اس احساس سے سرشار تھے کہ وہ دراصل ایک مذہبی فریضہ سرانجام دے رہے ہیں۔ ان میں سے بعض تو باقاعدہ مذہبی عہدوں پر فائز تھے اور معاشرے میں تقویٰ شعاری کے حوالے سے جانے جاتے تھے۔ یہ صورت حال آخر آخر تک قائم رہی۔ مثال کے طور پر ابن نفیس (متوفی ۱۲۸۸ء) جس نے ابن سینا کے القانون فی الطب کا تنقیدی محاکمہ لکھا اور جس کی دورانِ خون کی بعض دریافتوں نے دنیائے طب کو انقلاب انگیز تبدیلی سے دوچار کیا، وہ فقۂ شافعی کے اساطین میں سے تھے۔ اسی طرح نصیرالدین طوسی (متوفی ۱۲۷۴ء) جن کا Tusi Couple (الصغیرہ والکبیرہ) بطلیموسی نظریات کے رد میں سنگ میل سمجھا جاتا ہے اور جس نے آنے والے دنوں میں ایک متبادل نظام کائنات کے تخیل کا راستہ ہموار کیا، ان کا شمار اپنے عہد کے کبار اسمٰعیلی علماء میں ہوتا تھا۔[۳۷] کچھ یہی حال ان کے شاگرد رشید قطب الدین شیرازی (متوفی ۱۳۱۱ء) کا ہے، جو مراغہ کی رصدگاہ سے وابستہ رہے، جنھوں نے نہ صرف یہ کہ طوسی کے تذکرہ پر شرحیں لکھیں بلکہ اس فن پر بعض طبع زاد کتابوں کا اضافہ بھی کیا۔ شیرازی ان تمام تر علمی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ مقامی عدالتوں میں قاضی کے منصب پر بھی فائز رہے۔ یہاں تک کہ ان کے قلم سے جامع اصول الحدیث، شرح السُنۃ اور فتح المنان فی تفسیر القرآن جیسی وقیع کتابیں بھی نکلیں۔ نظام الدین نیشاپوری (متوفی ۱۳۲۸ء) جو اپنی سائنسی تالیف شرح التذکرہ اور شرح المجسطی کے حوالے سے شہرت رکھتے ہیں وہ بیک وقت غرائب القرآن و رغائب الفرقان کے مصنف بھی ہیں۔ ابن شاطر جن کی تحریروں سے مغرب میں نئے نظام کائنات کی بحث شروع ہوئی اور جس کے سرقے سے کوپرنکس کو مغرب میں جدید دنیا کا بانی مبانی سمجھا گیا ان کی بابت تو ہر شخص کو معلوم ہے کہ وہ دمشق کی مسجد اموی میں موقیت کے عہدے پر مامور تھے۔ حتیٰ کہ وہ لوگ بھی جن کے التباس فکری اور آزاد خیالی کا چرچا ہوتا رہا ہے جس میں ابن رشد کا نام سرِفہرست ہے وہ بھی اشبیلیہ اور قرطبہ میں عہدۂ قضاۃ سے وابستہ تھے۔ گویا ظہورِ اسلام سے سولہویں صدی عیسوی تک تحریک تسخیر و اکتشاف بنیادی طور پر ایک مذہبی تحریک تھی جس کی کمان اہلِ مذاہب کے ہاتھوں میں تھی۔ اپنے تمام تر التباس فکری کے باوجود جس سے مسلم فکر کے دھارے ابتدائی صدیوں میں مختلف سمتوں میں بہنے لگے تھے اکتشافی علوم کی دینی حیثیت مشکوک نہیں ہوئی تھی۔ البتہ سولہویں صدی عیسوی کے آخر آخر تک ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قلب و نظر میں کسی نامحسوس، تقلیب انگیز تبدیلی کے لیے فضا ہموار ہو رہی ہو۔ ان عوامل کا تفصیلی محاکمہ تو ہم اگلے باب میں کریں گے۔ البتہ یہاں چند ضروری اشارات پر اکتفا کرنا مناسب ہوگا۔

عبدالملک کی سیاسی اصلاحات

عبدالملک کے عہد میں جب اسلامی ریاست ایک عرب امپائر کی صورت میں متشکل ہو رہی تھی بعض ایسے واقعات پیش آئے جس نے آنے والے دنوں میں ہمارے تہذیبی سفر پر فکری التباسات کی ایک دھند قائم کر دی۔ عبدالملک خود اپنے عہد میں گو کہ نزاعی حکمراں رہے اور ایک طویل عرصہ تک سرزمین حجاز میں ان کی حکمرانی قائم نہ ہو سکی جہاں ابن زبیر منصب خلافت پر متمکن تھے۔ لیکن بعد کے دنوں میں تاریخ کی کتابوں میں انھیں قبولیت عامہ مل گئی۔[۳۸] عبدالملک نے اپنی حکومت کے استحکام کے لیے جو مختلف اقدامات کئے اس میں ایک اہم قدم یہ تھا کہ انھوں نے پہلی بار اپنے انتظامی دفاتر اور حساب کتاب کے گوشواروں کو عربی میں منتقل کرنے کے احکامات صادر کیے۔[۳۹] اس طرح گویا آنے والے دنوں میں عرب بیوروکریسی کی راہ ہموار ہوئی۔ اس عہد میں ایک دوسرا بڑا واقعہ یہ ہوا کہ کہ بازنطینی حکمراں جسٹینین ثانی، جو تثلیث کا پرزور مبلغ تھا اور جسے یہ بات گراں گزرتی تھی کہ مسلم ریاست اپنے سرکاری خطوط کی پیشانی پر قل ھو اللہ احد لکھے اس نے عبدالملک کو یہ دھمکی دی کہ اگر اس نے اپنے موقف پر اصرار جاری رکھا تو وہ سکوں پر رسول اللہؐ کے سلسلے میں ایسے الفاظ کندہ کرادے گا جس سے مسلمانوں کے جذبات مجروح ہوں گے۔[۴۰] کہا جاتا ہے کہ عہد عبدالملک تک سونے اور چاندی کے سکے یا تو بازنطینی ٹکسال کے ڈھلے ہوتے تھے یا پھر ساسانی ریاست کے باقیات کے طور پر ان کی تصدیق شدہ مہروں کے سبب معتبر سمجھے جاتے تھے۔ روزمرہ کا لین دین ان ہی سکوں کے ذریعے انجام پاتا تھا۔ بازنطینی دھمکی نے عبدالملک کو فوری اقدام پر آمادہ کیا اور یہ بات طئے پائی کہ مسلم ریاست اب اپنی ٹکسال کا اہتمام خود کرے گی۔ عربوں کے لیے یہ میدان خاصا نیا تھا۔ خالد بن یزید جو الکیمی سے دلچسپی کے لیے معروف تھے،[۴۱] مشاورت کے لیے طلب کیے گئے اور پھر اس فن پر باقاعدہ مہارت کے لیے جدوجہد شروع ہوگئی۔ یہ دو عوامل ایسے تھے جنھوں نے اجنبی مآخذ سے فنی کتب کے ترجموں کی راہ ہموار کر دی۔

مسلم ریاست کے لیے ٹکسال کا قیام اپنی نوعیت کا ایک انوکھا تجربہ تھا سو یہ عین فطری تھا کہ وہ اس بابت مروجہ فنّی معلومات کے تجمیع اور تحلیل و تجزیہ کا اہتمام کرتی۔ دوسری طرف دیوانِ محصولات کو عربی قالب مل جانے سے نئے عرب ملازمین کو اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ نظام مالیات و محصولات کی تہذیب و تنظیم کے سلسلے میں اس فن کی مروجہ کتابوں کو عربی زبان میں منتقل کروائیں۔ اس طرح مفتوحہ علاقوں میں جو کچھ علمی یا فنّی سرمایہ موجود تھا اس کے ترجمے کی ضرورت کا احساس تیز تر ہوتا گیا۔ مسلمانوں کا ابتداء سے ہی یہ رویہ تھا کہ وہ مفتوحہ علاقوں کو تاراج کرنے کے بجائے ان کے انتظامی ڈھانچے میں اصلاح کو پسند کرتے اور بسا اوقات مقامی گورنروں اور عاملوں کو بشرط وفاداری اپنے

عہدوں پر برقرار رکھتے۔ یہ احساس عام تھا کہ فکر وفن کسی قوم کی اجارہ داری نہیں یہ انسانیت کا مشترکہ سرمایہ ہے سوا سے قبول کرنے میں کسی تکلّف کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہئے۔ الحکمة ضالّة المومن کی اس فضا میں اجنبی مآخذ سے ترجموں کو بنظرِ استحسان دیکھے جانے کا وافر فکری جواز موجود تھا۔ اگر ہمارے مترجمین صرف ترجمے پر اکتفا کرتے تو اکتساب و استفادے کی ایک صحت مند روایت قائم ہونے میں کچھ زیادہ دشواری پیش نہ آتی۔ پھر وہ کتابیں جن کی تصنیف پر پانچ سات صدیوں کا عرصہ گزرا تھا اور جن کی علمی غلطیاں ہر خاص و عام پر واضح تھیں انھیں بآسانی از کارِ رفتہ سمجھ کر مسترد کر دیا جاتا۔ لیکن ہوا یہ کہ مترجمین نے اہل یونان کی جن فنّی کتابوں کے ترجمے کیے انھیں مروجہ معلومات کی روشنی میں تصحیح و تجدید کا سزاوار بھی قرار دے ڈالا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان از کار رفتہ کتابوں کا اپنا اصل مقام متعین نہ ہو سکا اور انھیں علم وفن کے لازوال ماخذ کے طور پر دیکھا جانے لگا۔ اس قبیل کی ایک بہترین مثال المجسطی کا وہ ترجمہ ہے جو حجاج بن مطر کے ہاتھوں انجام پایا تھا۔ مترجم نے یہاں صرف ترجمے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنے علم کی حد تک بطلیموس کی اس کتاب کو جدید اور مستند معلومات سے مزین کرنے کی بھی کوشش کی۔[۴۲] فنّی کتابوں کی جدید کاری نے اہل یونان کی علمی عظمت کا طلسم قائم کرنے میں بنیادی رول ادا کیا۔ پھر آگے چل کر عباسی بغداد میں جب تحریک ترجمہ نے ایک علمی تحریک کی شکل اختیار کر لی اور ہر قسم کا رطب و یابس ترجمے کی میز پر آ گیا جن میں فلسفہ وفلکیات کی کتابیں بھی تھیں تو عام قاری کے لیے یہ خاصا مشکل ہو گیا کہ ان فرسودہ علوم کے دفتر سے کارآمد خیالات کو الگ کرے۔ اہل یونان کی کن مسلمہ باتوں کو صحیح مان لے اور کن باتوں کو گمراہ کن قرار دے۔ سچ تو یہ ہے کہ ارسطاطالیسی نظام فکر نے مسلم ذہن کو خاصے عرصے تک فکری تشتت سے دوچار کیے رکھا۔ ردوقبول اور تحلیل و تجزیہ میں کئی صدیاں ضائع ہو گئیں۔ فلکیاتی اور سائنسی التباساتِ یونانی سے تو انھیں نجات بھی مل گئی البتہ تفسیر و تاویل کے منہج میں کلامی ذہن کی کارفرمائیوں سے آج بھی مسلم فکر جاں بلب ہے۔ اس تکلیف دہ صورت حال کا محاکمہ تو اگلے باب میں آئے گا یہاں ہم صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ عہد اُموی اور عباسی میں تقریباً تین سو برسوں تک مترجمین کے ہاتھوں جو کچھ انجام پاتا رہا وہ صرف ترجمے کا سیدھا سا عمل نہ تھا جیسا کہ مغرب میں یہ خیال عام ہے کہ اہل یونان کے ترجموں سے مسلمانوں نے اپنی تہذیب کا چراغ روشن کیا[۴۳] اور پھر جب یہ روشنی یورپ کو منتقل ہو گئی تو مشرق میں علم وحکمت کا آفتاب غروب ہو گیا۔ ہمارے خیال میں تحریک ترجمہ ہماری فکری تاریخ کا ایک ایسا باب ہے جو زبردست فکری بحران اور ذہنی تشتت سے عبارت ہے۔ یہ ایک ایسا انوکھا علمی معرکہ ہے جس میں فاتح اور مفتوح کا فیصلہ کرنا مشکل ہے۔

بظاہر تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ارسطاطالیسی نظام فکر کو کبھی بھی قبولیت تامّہ حاصل نہیں ہو سکا۔ ترجمے کی روایت ابھی پوری طرح مستحکم بھی نہ ہو پائی تھی کہ مسلم علماء کے قلم سے یونانی مفکرین کی کتابوں پر شبہات وارد کئے جانے لگے

یہاں تک کہ جلد ہی کتب شکوک کی ایک نئی روایت قائم ہوگئی۔ مثال کے طور پر ابوبکر ذکریا الرازی نے کتاب الشكوك على جالينوس مرتب کی اور ابن الہیثم نے الشكوك على بطليموس لکھی۔[۴۴] اس قبیل کی ایک اور کتاب الاستدراك على بطليموس ہے جس کے بارے میں ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ یہ کسی اندلسی مصنف کی تصنیف ہے۔[۴۵] ابوعبید الجزجانی (متوفی ۱۰۷۰ء) نے بطلیموس کے تصور الفلك المُعَدِّل اَلمَسِير (Equant) کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا۔[۴۶] گویا ہند، یونان اور فارس کی کتابوں سے ترجمہ ہو کر جو کچھ آیا تھا اسے من وعن قبول کرنے کے بجائے اسے تحلیل و تجزیہ کی کسوٹی پر پرکھا گیا اور یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ابوالبرکات البغدادی (متوفی ۱۰۲۳ء) اور فخر الدین الرازی (متوفی ۱۲۰۹ء) جیسے متکلمین اگر ارسطو کے سخت ناقد رہے[۴۷] تو ابوبکر ذکریا الرازی اور البیرونی جیسے سائنسدانوں نے بھی ارسطو کے تصور تخلیق کائنات اور نظریۂ تغیر و تبدل کو کبھی بھی لائق اعتناء نہ سمجھا۔ بارہویں صدی عیسوی کی ابتداء میں ابوالفتح عبدالرحمٰن الخازینی کی تصنیف كتاب ميزان الحكمة نے نہ صرف یہ کہ ارسطاطالیسی نظریہ کائنات کی اینٹ سے اینٹ بجادی بلکہ پہلی بار دنیا کے سامنے مرکز کشش ثقل کا وہ نظریہ پیش کیا جس نے آنے والی نسلوں کے لیے سائنسی فتوحات کے دروازے کھول دیئے۔ لیکن ان علمی فتوحات کا ایک تکلیف دہ پہلو یہ بھی ہے کہ اہل یونان کی علمی عظمت کے طلسم سے نکلنے میں مسلمانوں کی کئی صدیاں ضائع ہوگئیں اور سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ ان ابتدائی صدیوں میں جب مسلم اہل فکر اہل یونان کی کتابوں سے اشتغال کرتے رہے اور یہ کتابیں اپنی تمام تر فنی فرسودگی اور از کار رفتہ معلومات کے باوجود علمی مناقشے کا حوالہ بنی رہیں قرآنی دائرۂ فکر میں کسی راست اکتشافی تحریک کا ڈول نہ ڈالا جاسکا۔ لہٰذا نزول قرآن کے سبب سپردہ نفوس کی جو خواب آسا اکتشافی دنیا وجود میں آنا چاہئے تھی، چشم فلک اس کا نظارہ دیکھنے سے محروم رہ گئی۔

یونانی طلسمِ علمی کو چاک کرنے میں مسلم اہل فکر پر کیا گزری اور کس طرح وہ صدیوں ذہنی تشتت سے دوچار رہے اس کا کسی قدر اندازہ ابن الہیثم کے اس تنقیدی لب ولہجہ سے ہوتا ہے جو اس نے المجسطی اور كتاب المنثورات پر سخت احتجاج کرتے ہوئے درج کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

> اسے (بطلیموس کو) یا تو اس بات کا اندازہ تھا کہ وہ جن مفروضات پر اپنے کلیہ کی بنیاد رکھ رہا ہے وہ ایک امر محال ہے یا وہ اس بات سے قطعی ناواقف تھا۔ اگر وہ امر محال جان کر بھی اس خیال کا قائل تھا تو یقیناً یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس کا علم خام تھا اور اس کے تصورات و مفروضات سب گمراہ کن تھے جس کے لیے اسے یقیناً مورد الزام قرار نہیں دیا جاسکتا۔ لیکن اگر اس نے ان مفروضات کو اسرار و عواقب کے نتائج کا اندازہ لگانے کے باوجود اختیار کیا جیسا کہ صاف ظاہر ہے اس لیے کہ اس کے پاس اس مسئلہ کا کوئی دوسرا بہتر حل موجود نہ تھا اور اس

نے دانستاً اپنی غلطیوں سے صرف نظر کیا تو یقیناً وہ دوہری غلطی کا مرتکب ہوا ہے۔ پہلی بار تو ان مفروضات کو اختیار کرنے کے سبب جس کا ناممکن العمل ہونا واضح تھا اور دوسری بار اس غلطی سے صرفِ نظر کرنے کے سبب کہ وہ دانستاً ایک غلطی کر رہا ہے...اس بات میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ سیاروں کی حرکت کے صحیح زاویے موجود ہیں جن میں باہم نہ کوئی تضاد ہے اور نہ ہی اس پر امر محال کا گمان ہوتا ہے لیکن یہ بطلیموس کے مقرر کردہ خطوط سے یکسر مختلف ہے۔ بطلیموس پر اس کی حقیقت واضح نہیں ہوسکی تھی اور نہ ہی اسے اس مسئلہ کا ادراک حاصل تھا۔[۴۸]

ابن الہیثم ہی پر کیا موقوف اہل یونان کے فلکیاتی تصورات کا بعید عن القیاس ہونا پہلی نسل کے مترجمین پر بھی واضح ہوگیا تھا لیکن تحریک ترجمہ نے دانش یونانی کا کچھ ایسا جلال و دبدبہ قائم کر رکھا تھا کہ ان تصورات کو فی الفور کالعدم قرار دینا آسان نہ تھا۔ ثانیاً ان کی فرسودگی واضح ہونے کے باوجود علمی گفتگو کی بزم ان ہی قدماء کے حوالے سے سجائی جاتی رہی ورنہ اہل فن کا ایک خاصا بڑا حلقہ اس حقیقت سے آگاہ تھا کہ اوجِ شمس (Solar Apogee) کے تعین کے دوسرے بہتر طریقے بھی ہوسکتے ہیں جیسا کہ فصول کی بنیاد پر بعض اہل فن نے مامون کے عہد میں زیج الممتحن کی ترتیب کے ذریعے واضح کیا۔[۴۹] لیکن ان تمام تر مبینہ علمی نقائص کے باوجود معاشرے میں ایسے لوگوں کی کمی نہ تھی جو اپنے مشاہدے کے برخلاف یہ کہتے نہ تھکتے کہ اگر بطلیموس، جالینوس یا ارسطو کی کتابوں میں یوں لکھا ہے تو حقیقت یہی ہوگی۔ گویا معاشرے کا ایک غالب حصہ ایک طرح کی دانشورانہ احساس کمتری کا شکار تھا اور یہ کچھ وہی صورتحال تھی جسے Kant کی اصطلاحِ مستعار میں Self-imposed immaturity کہنا چاہئے۔ مدینۃ الحکمۃ نے ازکار رفتہ ترجموں کی جو بزم سجائی تھی اس کے مقابلے میں، صاف محسوس ہوتا تھا، کہ خدا کی نازل کردہ کتاب الحکمۃ کی چمک بھی ماند پڑ گئی ہو۔ خود اعتمادی اور تخلیقی فکر کا آبشار خشک ہوگیا ہو۔ ایسی صورتحال میں ابن الہیثم کی یہ جھنجھلاہٹ فطری تھی:

"بطلیموس نے پانچ سیاروں کا جو خیالی نظام وضع کیا ہے وہ ایک خیالی اور لغو بات ہے، اس کا مہمل ہونا خود اس پر بھی واضح تھا لیکن وہ اس سے زیادہ کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا۔ سیاروں کی حرکت اپنے اصل مدار پر قائم ہے اور یہ کسی عالمِ خیال میں نہیں بلکہ عملی دنیا میں ہو رہا ہے لیکن بطلیموس اس صورتِ حال کو سمجھنے سے یکسر قاصر رہا۔"[۵۰]

اپنے عہد کے دوسرے مفکرین کے مقابلے میں ابن الہیثم کو اس بات کا کہیں شدت سے احساس تھا کہ بطلیموسی فلکیات فی نفسہٖ بے اصل اور غیر علمی بنیادوں پر قائم ہے جسے خیر باد کہے بغیر ایک علمی اور سائنسی منہج کا قیام ممکن نہیں۔ ابو جعفر البطر وجی، جنھوں نے بالآخر بطلیموسی نظام کی اینٹ سے اینٹ بجادی انھیں بھی اس بات کا خوب اندازہ تھا کہ یونانی تراجم کی ہیبت کس طرح صدیوں خالصتاً قرآنی دائرۂ فکر میں ایک علمی تحریک کے امکانی نمو کا راستہ روک کر بیٹھ

گئی۔ بقول بطرو جی بطلمیوس کا قائم کردہ ماڈل رصدی وحسّی مشاہدے سے مطابقت نہیں رکھتا اور یہ کہ اُس نے جو کچھ بھی لکھا ہے اس کی بنیاد توہم پر ہے حقیقت پر نہیں۔[۵۱]

سنت اللہ بنام دانش یونانی

دانش یونانی کی مسلسل مزاحمت اور تحریک ترجمہ کی پیدا کردہ مسلسل بلند ہوتی لَے کے باوجود نزول وحی پر کوئی دو ڈھائی سو سال کا عرصہ بھی نہ گزرا ہوگا کہ مسلمانوں نے تمام مروجہ علوم کا احاطہ کرلیا۔ انسانی تہذیب کی اب تک کی پیش رفت تحلیل وتجزیہ کی میز پر لے آئی گئی۔ اہل یونان کے علمی ہیبت وجلال کے باوجود مسلم دانشوری کی زیریں لہریں اپنا کام کرتی رہیں۔ ابتدائی صدیوں کا مسلم ذہن جس پر حکمت بالغہ[۵۲] کی چھاپ اب بھی بڑی نمایاں تھی اس کائنات کو ایک منطقی اور مربوط نظام سے تعبیر کرتا تھا۔ اسے اس بات کا گہرا شعور تھا کہ شمس وقمر کی گردش، قوموں کا عروج وزوال اور کائنات میں جہد پیہم کے لامتناہی سلسلے مربوط اور منظّم قوانین کی رہین منت ہیں۔ خدا نے ہر چیز کے تغیر وتبدل، عروج وزوال اور اس کے خواص وتناسب کا ایک قانون طے کر دیا ہے سو اہل تسخیر کے لیے لازم ہے کہ وہ ان قوانینِ فطرت کا نہ صرف یہ کہ درک حاصل کریں بلکہ اسے کمال احتیاط کے ساتھ برتنے کا سلیقہ بھی رکھتے ہوں۔ فطرت کے یہ قوانین اور عروج وزوال کے یہ مسلّمات غیر جانبدار اور غیر مبدّل ہیں۔ دنیا کی جو قوم بھی خدا کے ان قوانین سے خود کو ہم آہنگ کر لے گی، رازِ کائنات اس پر منکشف ہوگا، تسخیر واکتشاف کی دنیا اس پر وا ہوگی، سیاست وقیادت کا منصب اس کے لیے محفوظ ہو جائے گا۔ خدا کی یہ سنت، جسے قوانین فطرت کہیے، کسی شخص، قوم یا عہد کے لیے مخصوص نہیں کہ ﴿وَلَن تَجِدَ لِسُنَّةِ اللهِ تَبدِيلا﴾۔

سنت اللہ پر گہرا یقین اور حکمت بالغہ کی شناوری فکری تشتت کی ان صدیوں میں بھی مسلمانوں کو مسلسل سِرّ کائنات کی بے نقابی پر مہمیز کرتی رہی۔ محمدؐ رسول اللہ نے اپنے متبعین کو کتاب کی تعلیم کے ساتھ حکمت سے بھی متصف کیا تھا: ﴿ويعلمهم الكتاب والحكمة﴾۔ آپؐ نے وحی ربانی کی روشنی میں ایک ایسے عقلی دائرۂ فکر کی تشکیل کی جو انسان کو مکمل ذہنی بلوغ کے ساتھ کائنات کے مشاہدے اور اس کی تسخیر واکتشاف پر آمادہ کر سکے۔ حکمت قرآن سے باہر نہیں بلکہ خود ''تزکیہ ربانی'' کا پیدا کردہ وحی آسا عقلی رویّہ تھا۔ بالفاظ دیگر یہ کہہ لیجئے کہ جو کوئی بھی خالی الذہن ہو کر سلیم القلبی کے ساتھ وحی ربانی کا مطالعہ کرے گا وہ حکمت کی نعمت سے متصف ہوگا اور پھر جب یہ صاحب حکمت کتاب و کائنات پر نظر ڈالے گا تو کتاب کی بہترین فہم اور کائنات کے سِرّ الاسرار اس پر منکشف ہوتے جائیں گے۔ سنت اللہ

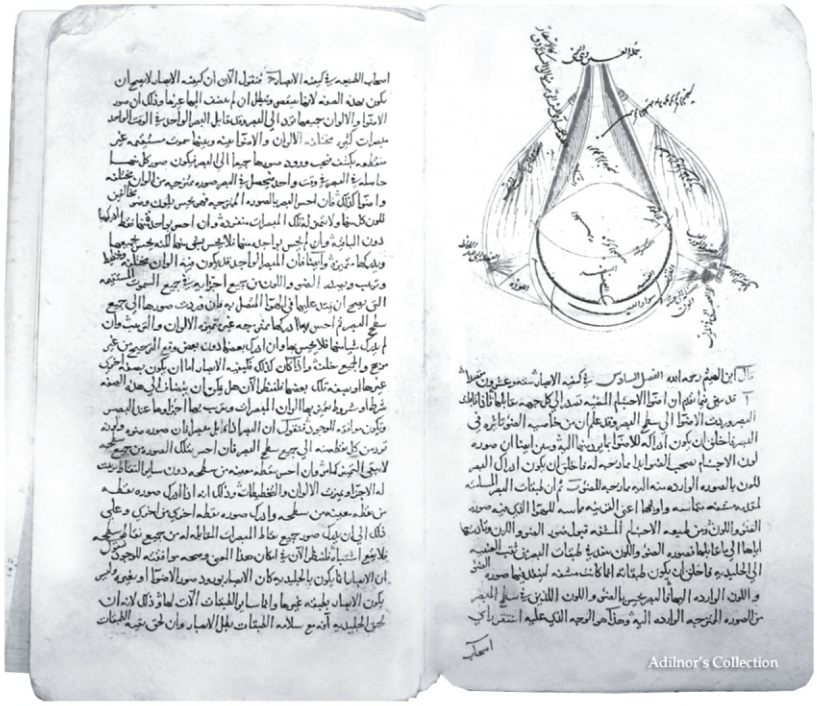

کتاب المناظر: جس نے تجرباتی اور مشاہداتی منہج کی بنیاد رکھی۔

ابن الہیثم کی اصطلاح اعتبار اور معتبر لاطینی میں Experimentum کہلائی جہاں سے انگریزی کا لفظ Experiment ماخوذ ہے۔

کی اس تفہیم اور حکمتِ بالغہ کے اسی شعور نے مسلم اہل فکر کو اس ایقان سے سرشار کیا کہ علم و انکشاف ایک بے کنار سمندر ہے ''انسان کو چاہیے کہ وہ تمام کائنات کے اسرار منکشف کرنے کی کوشش کرے اور یہ کہ اس عالم سے ماوراء جو اسرار ہیں ان سب کو منکشف کرنے کی صلاحیت اسے عطا کی گئی ہے''۔[۵۳]

کتاب و حکمت سے مملو وحی آمیز عقلی رویّے نے ایک نئے منہج علمی کو جنم دیا جس کی بنیاد قیاس مع الفارق استخراج یا توہمات کے بجائے مشاہدے اور تصدیقی تجربے پر رکھی گئی۔ قال الافلاطون یا قال البطلیموس پر انحصار کے بجائے نئے مسلم ذہن نے جو علمی منہج اختیار کیا اس کی ایک جھلک البیرونی کے اس اقتباس میں دیکھنے کو ملتی ہے:

''میں نے وہی کیا ہے جو ہر انسان پر واجب ہے، کہ وہ اپنے فن میں مہارت حاصل کرے یعنی اس فن میں جو لوگ اس سے پہلے ہو گزرے ہیں ان کے اجتہادات کو قبول کرے۔ اور اگر کچھ خلل پائے تو بے جھجک اس کی اصلاح کر دے اور جو کچھ خود اسے سوجھے اسے اپنے بعد آنے والے متأخرین کے لیے بطور ایک یادداشت،

محفوظ کر جائے۔''[۵۴]

عقل ومشاہدہ اور تفکر وتدبر کے اس نئے استقرائی (empirical/inductive) منہج علمی[۵۵] نے انسانی تہذیب کو ایک نئے غلغلہ اور ایک بالکل ہی نئی جہت سے آشنا کیا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے پوری کتاب کائنات یکسر مطالعہ کے لیے کھول دی گئی ہو اور امکانات کی ایک نئی دنیا وجود میں آنے کو بے تاب ہو۔ جب انسان اس یقین واثق سے سرشار ہو کہ دنیا دراصل ریاضیاتی قانون پر قائم ہے اور یہ کہ عالم موجودات کی عددی توجیہ عین ممکن ہے، جیسا کہ جابر نے اس خیال کا اظہار کیا کہ خواص اشیاء کی عددی تاویل اگر مہیا کی جا سکے تو اشیائے عالم کے لیے ریاضیاتی حتمیت کے میزان کا اصول قائم کرنا ممکن ہو سکے گا یا اس کا یہ دعویٰ کہ یہ اصول اشیاء اور اس کی داخلی ہم آہنگی کے ایک نظام کی وضاحت کرتا ہے، ہر شئے میں اس کا ظہور ہے اور یہی دنیا کا مجرد اساسی مفہوم[۵۶] بھی۔ تو یہ سمجھئے کہ اس نے آنے والی نسلوں پر اسباب وعلل کی اس دنیا کا اساسی راز منکشف کر دیا۔

اس نئے منہج علمی کی بنیاد طلب حق پر رکھی گئی تھی۔ مسلم علماء اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ قرآن مجید کی دعوت اکتشاف نے ان پر ایک بڑی ذمہ داری عائد کر دی ہے۔ بقول ابن الہیثم حقائق شبہات میں ڈوبے ہوئے ہیں لہٰذا ''طالب حق وہ نہیں جو متقدمین کی کتابوں کا محض قاری ہو اور ان پر حسنِ ظن میں اپنے طبعی رجحانات کے ساتھ بہہ جائے بلکہ طالب حق وہ ہے جو ان کے بارے میں اپنے ظن پر بھی شک کرے... اگر وہ اس روش کو اختیار کر سکے تو حقائق اس پر منکشف ہو سکیں گے اور متقدمین کے یہاں جو امکانی کوتاہی یا اشتباہ رہ گیا ہوگا اسے نظر آ جائے گا۔''[۵۷] اس نئے منہج علمی نے جس کی اشاعت نزول وحی کے بعد مختلف بلاد وامصار میں مسلسل ہوتی رہی تھی ہمارے تہذیبی سفر کے بے لاگ تجزیے اور نوع انسانی کے کارواں کو نئے خطوط پر منظّم کرنے میں کلیدی رول انجام دیا۔ انسانی تہذیب جو تاریخ کی عظیم ترک تازیوں، باجبروت بادشاہوں کے تذکروں، عاد وثمود کے عبرت انگیز قصّوں، داؤد وسلیمان کے جاہ وحشم اور حکمت لقمان کے مسرت آگیں تذکروں کے باوجود کتاب فطرت سے ناواقفیت کے سبب بے سمتی کا شکار تھی، دیکھتے دیکھتے تسخیر واکتشاف کی ایک نئی دنیا سجانے لگی۔

نیا ذہن: نئے امکانات

یہ نیا منہج علمی جس کی بنیاد ظن وتخمین کے بجائے مشاہدے اور تجربے پر رکھی گئی تھی آنے والے دنوں میں رصد گاہوں کے قیام پر منتج ہوا۔ کوئی ہزار برسوں تک، جب تک عالم اسلام میں غور وفکر کی روایت زندہ رہی، مختلف بلاد و

امصار میں نئی نئی رصد گاہیں قائم ہوتی رہیں۔[۵۸] جب متجسس نگاہیں ایک بار آسمان کی طرف اُٹھ گئیں تو اس قسم کے سوالات فطری تھے: یہ فضا، یہ فلک اور آسمان کا یہ لاجوردی رنگ، اس کی حقیقت کیا ہے؟[۵۹] ہوائیں کیوں چلتی ہیں اور یہ کہ موسم گرما کی اکثر ہوائیں شمالی اور موسم سرما کی اکثر ہوائیں جنوبی کیوں ہوتی ہیں؟ الکندی نے ان سوالوں کے جو جواب فراہم کئے وہ بعینہ وہی تھے جو اٹھارہویں صدی عیسوی کے George Hadley اور Immanuel Kant سے منسوب کئے جاتے ہیں۔[۶۰] النریزی نے بادلوں اور بخارات کی بلندی کی پیائش کی اور سہل الکوہی نے یہ پتہ لگانے کی کوشش کی کہ شہابیے کن کن فاصلوں پر ہیں۔ ابتدائی چند صدیوں میں تسخیر و اکتشاف کی اس تحریک نے عالم اسلام کو مسلسل ایک طرب انگیز کیفیت سے دوچار کئے رکھا۔ صورتِ حال کی صحیح تصویر کشی کے لیے لازم ہے کہ ہم اجمالی بیان کے بجائے تحریکِ اکتشاف کے چند غلغلہ انگیز لمحات کا قدرے تفصیلی تذکرہ کریں۔

یہ بات ہمارے علم میں ہے کہ عالم اسلام میں پہلی باقاعدہ رصدگاہ عہد مامون میں شمّاسیہ بغداد اور دمشق کے نواح میں کوہ قاسیون پر قائم کی گئی تھی۔ اس منہج علمی کا پہلا ثمر جو مسلمانوں کی جھولی میں گرا وہ Arch of the Mediteranian یعنی خط استوا کے طول کی پیائش تھی۔ علمائے اکتشاف نے تدمر اور رقّہ کے مابین ایک درجے کے طول کی پیائش کی اور اس کے ذریعے خط استوا کا طول چالیس ہزار دو سو ترپن (40,253) کلومیٹر دریافت کرلیا جو غیر معمولی طور پر محتاط پیائش کی ایک کامیاب مثال تھی۔ پھر کیا تھا جلد ہی الزیج الممتحن کے نام سے علوم فلکیات کی جدولیں تیار ہونے لگیں اور اس بات کی کوشش کی جانے لگی کہ دنیا جیسی کہ وہ ہے اسے ٹھوس علمی بنیادوں پر ایک نقشے کی شکل میں مرتب کر دیا جائے۔

آنے والے دنوں میں البیرونی کی شہرۂ آفاق تصنیف کتاب تحدید الاماکن نے محیط ارضی کی پیائش کا ایک اور طریقہ دریافت کرلیا۔ البیرونی نے اس خیال کا اظہار کیا کہ اگر Mural Quadrant نامی آلے کا استعمال کیا جائے تو اس قسم کی پیائش کے لیے صحرا نوردی کی ضرورت نہیں ہوگی۔ یہ اور بات ہے کہ آج Mural Quadrant کو Tycho Brahe کی ایجاد سمجھا جاتا ہے اور اس مناسبت سے اس کا نام Tychonicus پڑ گیا ہے۔[۶۱] البیرونی کی اس تنقید سے قطع نظر عہد مامون کے اصحاب اکتشاف کے سامنے ایک ایسی دنیا کی تحدید کا کام تھا جس کی نظیر انسانی تاریخ میں اس سے پہلے نہیں ملتی۔ ایک ایسے خریطۂ عالم (World Map) کی ترسیم کا خیال جس میں کائنات اپنے حدود اربعہ، سیاروں، زمین، سمندر، آباد اور غیر آباد علاقے، شہر اور بن اپنی تمام تر ابعاد کے ساتھ جلوہ گر ہوں۔[۶۲] بلاشبہ اپنی نوعیت کا ایک عظیم الشان منصوبہ تھا۔ بارہویں صدی عیسوی میں الادریسی نے سسلی کے عیسائی شہنشاہ روجر کی فرمائش پر خریطۂ عالم کی ترتیب کے ساتھ نزهة المشتاق فی اختراق الآفاق (Book of Roger) تالیف کی جس میں اس

وقت کی دنیا کی تقریباً تمام ہی معلومات کا احاطہ کرلیا گیا۔

خریطۂ عالم کے وجود میں آجانے اور اس فن میں اکتشافی مسلمانوں کی مہارت کے سبب دنیا کے بارے میں قصّے کہانیوں اور پراسرار خیالی واقعات کی دھند اب بڑی حد تک چھٹ گئی۔ اب تک ساسانی، فارسی اور ہندی جغرافیہ دانوں نے جو کچھ بھی لکھا تھا اسے ذاتی مشاہدے اور تجربات سے پرکھا گیا۔[۶۳] ۲۴ مئی ۹۹۷ء کو ابوالوفا (متوفیٰ ۹۹۸ء) اور ابوریحان البیرونی نے پہلی بار کاتھ اور بغداد کے مابین طول البلد کی پیائش کی۔ آمودریا (Oxus river) کے کنارے البیرونی اگر ایک طرف چاند گرہن کا انتظار کررہے تھے تو دوسری طرف بغداد میں ابوالوفا اس جستجو میں مصروف تھے کہ اسی چاند گرہن کے ذریعے ان دو جگہوں کے مابین طول البلد (Longitude) کی پیائش کیسے کی جائے۔ طول البلد کی صحیح ترین پیائش نے ان حضرات کو حیرت آمیز مسرت سے دوچار کردیا۔ پہلی بار یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ ارض وسمٰوات کی ماہیت انسانی حیطۂ ادراک کا اس حد تک حصہ بن سکتی ہے کہ وہ محض گردش شمس وقمر کے ذریعے اس کے طول وعرض سے واقف ہوسکتا ہے۔ البیرونی اور ابوالوفا کی اس مشترکہ دریافت نے انسانی فکر میں ایک ہلچل کی سی کیفیت پیدا کردی۔[۶۴]

گیارہویں صدی کے اواخر میں عمر خیام کی قیادت میں شہر اصفہان میں روز وشب کی باریک بین پیائش کا کام از سرِ نو شروع ہوا۔ متجسّس نگاہیں ایک بار پھر آسمانوں کے تعاقب میں لگ گئیں۔ بالآخر برسہا برس کی محنت شاقہ کے بعد سال ۱۰۷۹ء میں عمر خیام نے ایک سال کی طوالت 365.242198 دنوں پر محمول کی جو جدید تحقیق سے حیرت انگیز طور پر قریب ہے۔ فی زمانہ الکٹرونک آلات اور ایٹومک گھڑیوں کے عہد میں سال کی طوالت 365.242190 سمجھی جاتی ہے۔ عمر خیام جو مغرب میں رباعیات کے شاعر کی حیثیت سے معروف ہیں انھوں نے پہلی بار اس بات کا ناقابل تردید ثبوت فراہم کیا کہ زمین اپنے مدار پر گردش کرتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ عمر خیام نے جس مجمع عام میں شمع اور گلوب کی مدد سے زمین کی گردش کے ریاضیاتی ثبوت فراہم کئے اس میں ابوحامد الغزالی، جنھیں بعد میں حجۃ الاسلام کی حیثیت حاصل ہوگئی، بہ نفس نفیس موجود تھے۔

بطلیموس کے مفروضہ الفلك المعدّل للمسير (Equant) کا تذکرہ ہم پہلے کرچکے ہیں۔ ابن الہیثم نے اس تصور کو نہ صرف یہ کہ پوری شدت سے رد کیا بلکہ اس نے پہلی بار سیاروں کی حرکت کے سلسلے میں ایک قابل قبول توجیہ پیش کی۔[۶۵] ابن الہیثم کا موقف تھا کہ یہ بات قابل تسلیم نہیں ہوسکتی کہ کائنات میں کوئی ایسا دائرہ موجود ہو جو اپنے مدار پر اس کے مرکز سے گزرے بغیر مسلسل گردش میں رہے۔ البیرونی نے بطلیموس کی مشہور زمانہ کتاب کے بارے میں تو یہاں تک کہہ دیا کہ اس قبیل کی تحریروں کا علم ہیئت یا فلکیات سے کوئی تعلق نہیں۔[۶۶] بطلیموسی نظام کے اس مبینہ نقص نے علمائے فلکیات کو حقائق کا پتہ لگانے اور ایک نئے کائناتی ماڈل کی تشکیل پر آمادہ کیا۔ مغرب اقصیٰ میں البطر وجی (متوفیٰ

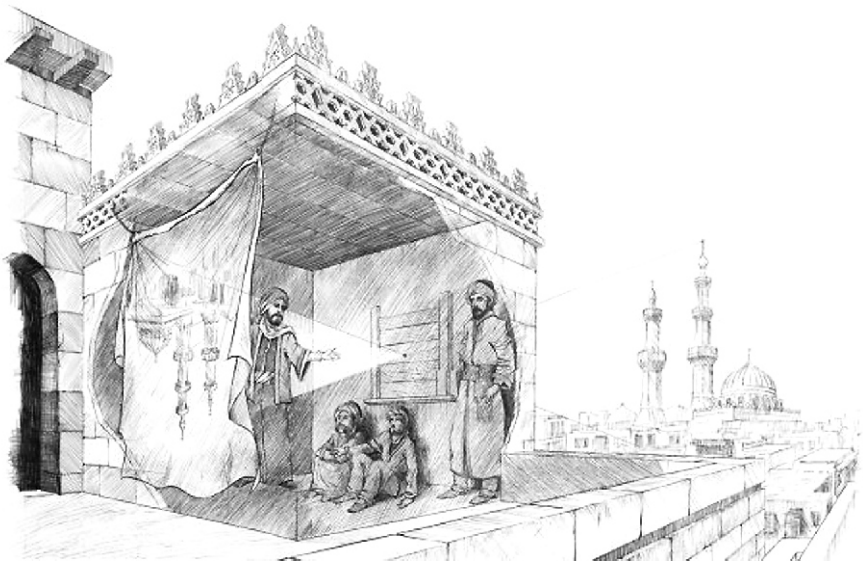

الهم أرنی الأشیاء کماهی

بابائے بصریات ابن الہیثم: اشیاء کو اس کی اصل ماہیت میں دیکھنے کی جستجو میں

۱۲۰۰ء) ابن رشد (متوفی ۱۱۹۸ء) اور جابر بن افلح (متوفی ۱۲۰۰ء) ایک نئے ماڈل کی تلاش میں مسلسل سرگرداں رہے۔

سچ تو یہ ہے کہ نویں صدی عیسوی کی ابتداء سے ہی بطلیموسی نظام شک کے دائرے میں آ گیا تھا۔ البتہ متبادل نظام کی تشکیل مراغہ کے اہل علم کے لیے مقدر تھی۔ نصیر الدین طوسی (متوفی ۱۲۷۴ء) نے اس سمت ایک اہم پیش رفت کی۔ انھوں نے زیج اِلْاِلْخانی کے نام سے ایک ہمہ گیر جدول مرتب کیا جس کی بنیاد Trigonometry پر رکھی اور جس کے سبب آسمانوں کی سمت اور مسافت کی پیمائش ممکن ہوگئی۔ طوسی نے الصغیرۃ والکبیرۃ (Tusi Couple) کا تصور دے کر آنے والی تحقیق کو المعدل المسیر کے گرداب سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نجات دلا دیا۔ طوسی نے اپنی کتاب تحریر المجسطی (مطبوعہ ۱۲۴۷ء) میں صرف بطلیموس کے رد پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنی دوسری تصنیف تذکرۃ (مطبوعہ ۱۲۶۰ء) میں ایک نئے متبادل کی طرف واضح اشارہ بھی کیا۔ بالآخر نصیر الدین طوسی (متوفی ۱۲۷۴ء) قطب الدین شیرازی (متوفی ۱۳۱۱ء) اور ابن شاطر (متوفی ۱۳۷۵ء) کی مجموعی کوششوں نے ہمیشہ کے لیے کائنات کے سلسلے میں ہمارے تصوّر کو بدل ڈالا۔ ابن شاطر نے اپنی تصنیف کتاب نهاية السول فی تصحيح الاصول میں ایک متبادل نظام کا جو خاکہ پیش کیا اس کی بنیاد تصدیق شدہ مشاہدے پر رکھی گئی تھی۔ ابن شاطر کے اس نئے ماڈل نے آنے والے

دنوں میں انسانی فکر کو ایک نئے انقلاب سے دوچار کر دیا۔[۶۷] اس ماڈل میں بعض جزوی تبدیلی، جسے علمی بددیانتی یا سرقہ کہنا چاہئے، کے بعد کوپرنکس نے اس دریافت کا سہرا اپنے سر باندھ لیا اور پھر استعمار کی صدیوں میں اس زور وشور سے پروپیگنڈہ ہوا کہ ہم کوپرنکس کو جدید دنیا کے معماروں میں شمار کرنے لگے۔[۶۸]

قرآنی دائرۂ فکر کے عام ہوجانے سے دیکھتے دیکھتے انسانی تہذیب کی ہیئت بدلنے لگی۔ وہ تمام علوم جن کی حیثیت زمانۂ قدیم سے مسلّم تھی اور جو یہ احساس دلاتے تھے کہ کائنات کی سریت عقدہ لاینحل ہے ان کا اعتبار ساقط ہونے لگا۔ رمل، نجوم، کہانت اور سفلی علوم پر کیا موقوف الکیمی جیسا محبوب مشغلہ بھی شک کے دائرے میں آ گیا۔ الکیمی کے بجائے علم کیمیا کی بنیاد پڑی۔ جابر جو اس علم کے بانی اور امام کی حیثیت رکھتا ہے اس نے تمام کیمیائی مظاہر کو قانون الاسباب کا تابع بتایا اور اس خیال کا اظہار کیا کہ انسانوں کے لیے ان اسباب کا پتہ لگانا عین ممکن ہے۔ بقول جابر، اشیاء کے خواص اس کے اندر پائے جانے والے مختلف اجزاء کے تناسب پر منحصر ہیں۔ آگے چل کر جابر کا یہ کلیۂ میزان Law of Proportion کے نام سے مشہور ہوا۔ المیز ان نظام کائنات کے ایک ایسے مجرد اساسی اصول کی حیثیت سے سامنے آیا جس کی بنیاد پر پوری کائنات کی ریاضیاتی توجیہ کے امکانات روشن ہو گئے۔[۶۹] جابر، جسے آج بھی بابائے کیمیا کی حیثیت سے شہرت حاصل ہے، نے تجربات کو علمِ کیمیا کی بنیاد قرار دیا۔ اس نے پہلی بار معدنیات سے تیزاب تیار کیے مثلاً گندھک کا تیزاب (سلفیورک ایسڈ) شورے کا تیزاب (نائٹرک ایسڈ) اور نمک کا تیزاب (ہائڈروکلورک ایسڈ) جس میں فولاد جیسی دھات کو پگھلا دینے کی صلاحیت پائی گئی۔ تیزاب کے اثر کو زائل کرنے کے لیے اس نے الکلی کی ایجاد کی۔ اس کے علاوہ بعض تیزاب کے مجموعے سے ماء الملوک (Aqua regia) تیار کیا جس میں سونا اور پلیٹنم جیسی دھاتیں بھی تحلیل ہونے لگیں۔ علم کیمیا کی ان ایجادات نے آگے چل کر مصنوعی کھاد، پلاسٹک کے سامان بلکہ کہہ لیجئے کہ سنتھٹک اشیاء کی دنیا بنانے میں کلیدی رول انجام دیا۔ کہا جاتا ہے کہ جابر کو کائنات کی کیمیائی اور ریاضیاتی تفہیم پر اس قدر اعتماد تھا کہ وہ سرّ کائنات کی بے نقابی کے ذریعے مصنوعی مخلوق بلکہ مصنوعی انسان بنانے کا خواب بھی دیکھنے لگا تھا۔ جابر کی پرواز تخیل عہد جدید کی کلوننگ کی تحقیقات پر اثر انداز ہوئی ہو یا نہیں البتہ مغرب میں بعض ادبی شہہ پاروں پر اس کے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔[۷۰]

نویں صدی عیسوی تک جب بصریات پر علمائے قدیم مثلاً اقلیدس [Euclid] (۲۹۵ ق م) اور جالینوس [Galen] (۱۲۹ء–۲۰۰ء) کا غلبہ تھا، عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ اشیاء کے دکھائی دینے کا عمل بینائی کے آنکھ سے نکل کر اشیاء کی طرف جانے کے سبب ہے۔ رازی (متوفی ۳۰۰ھ) نے اس خیال کا اظہار کیا کہ صورتِ حال اس کے بالکل برعکس ہے۔ غالباً وہ پہلا طبیب تھا جس نے یہ رائے قائم کی کہ آنکھ کی پتلی اس میں داخل ہونے والی روشنی کی

مناسبت سے پھیلتی یا سکڑتی ہے۔ ابن الہیثم، جسے قانون انعطاف (Law of Refraction) اور قانون انعکاس (Law of Reflection) کی دریافت کا اعزاز حاصل ہے، نے اس بات کے تجرباتی شواہد فراہم کیے کہ کسی شئے کو دیکھنے کے لیے روشنی آنکھوں سے نہیں نکلتی بلکہ باہر سے آنکھوں کے اندر داخل ہوتی ہے جس سے آنکھ کے اندر اس شئے کی تصویر مرتب ہو جاتی ہے اور ہم اس طرح دیکھنے پر قادر ہوتے ہیں۔ بصارت کے اصولوں کی توجیہ نے نہ صرف یہ کہ آنکھ کی اصل ساخت سے ہمیں متعارف کرایا بلکہ آگے چل کر بصریات کے قوانین مرتب کرنے اور دوربین کی ایجاد میں بھی ممد و معاون ثابت ہوئے۔ ابن الہیثم کے ایک دوسرے ہم عصر البیرونی نے روشنی کی رفتار کو آواز سے تیز تر ثابت کر دکھایا اور خود ابن الہیثم نے دنیا کو پہلی بار اس حقیقت سے باخبر کیا کہ روشنی کی رفتار بھی محدود ہے اسے بے زماں قرار نہیں دیا جا سکتا۔ مستقبل میں بصریات میں ہونے والی تحقیقات ابن الہیثم کے ان ہی اساسی نظریات کی مرہون منت رہیں جنھیں آج بھی بابائے بصریات یا بابائے طبیعات کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ ساتویں صدی ہجری میں کمال الدین الفارسی نے قوسِ قزح کے راز کو منکشف کر دیا[۱۷] اس نے بتایا کہ قوسِ قزح کا بننا دراصل فضا میں موجود قطروں میں شعاع کے ایک یا دو بار ٹوٹنے کے سبب ہے۔ شعاع کے ٹوٹنے میں زاویوں کا جو اختلاف ہوتا ہے اس سے مختلف رنگ پیدا ہو جاتے ہیں۔ قوسِ قزح کی یہ بعینہ وہی توجیہہ ہے جس کی دریافت کا سہرا سترہویں صدی عیسوی کے فرانسیسی مفکر ڈیکارٹ (Descartes) کے سر باندھا جاتا ہے۔

پہلی صدی ہجری تک اہل یونان کی طرح مسلمانوں میں بھی ابجدی نمبروں کے استعمال کا رواج تھا۔ کائنات کی ریاضیاتی تفہیم و تعبیر کے لیے اعداد و شمار کا روایتی طریقہ جب ناکافی معلوم ہونے لگا تو مسلمانوں نے ہندوستانی طریقۂ شماریات سے استفادے کی کوشش کی۔ الکندی نے ہندوستانی نمبروں کو رواج دینے کی کوشش کی لیکن اسے بعض عملی پیچیدگیوں کے سبب مقبولیت نہ مل سکی۔ الخوارزمی وہ پہلا شخص ہے جس نے صفر سے نو تک کے ہندسوں میں بڑی سے بڑی گنتی لکھنے اور اس میں مختلف قسم کے حسابی تصرفات کے امکانات کی ایک نئی دنیا آباد کر ڈالی۔ الخوارزمی کی کتاب الجبر و المقابلة سے ریاضی کی دنیا میں غیر معمولی انقلاب آ گیا۔ معاملہ وراثت کی تقسیم کا ہو یا زمین کی پیمائش کا، الجبر و المقابله نے انتہائی پیچیدہ حساب و کتاب کو آسان اور عام فہم بنا دیا۔ آنے والے دنوں میں خوارزمی کی یہ کتاب دنیائے ریاضی میں اتنی اہمیت اختیار کر گئی کہ اسے ریاضی کی ایک مستقل شاخ، الجبرا کی حیثیت دے دی گئی اور خود اس کا نام الخوارزمی جب یورپ پہنچا تو اس سے الگورِتھم منسوب ہو گیا جس کے دم سے آج بھی دنیائے کمپیوٹنگ کی رونق قائم ہے۔[۱۸]

الخوارزمی کی کتاب نے ہندی اعداد اور صفر کو جس طرح متعارف کرایا اس سے یقیناً حساب و کتاب میں بڑی

آسانی پیدا ہوگئی تھی۔ البتہ اس کتاب کو ابھی ایک صدی بھی نہ گزری تھی کہ احمد الاقلیدسی (متوفی ۹۸۰ء) نے کتاب الفصول فی الحساب الھندی کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں اس نے عدد سے بھی آگے بڑھ کر کسر اشاریہ (Decimal Fraction) کے جوڑ گھٹاؤ کا طریقہ ایجاد کیا[۷۳] جسے مغرب میں کئی صدیوں تک Simon Stevin (۱۵۷۸–۱۶۲۰) کا کارنامہ سمجھا جاتا رہا۔ تیسری صدی ہجری میں ریاضی کے علم نے اتنی وسعت اختیار کر لی کہ تفریقی مساواتوں (Differential Equations) اور تکملی احصاء (Integral Calculus) کا استعمال عام ہوگیا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ وہی مساوات (Equations) ہیں جنہیں (J. Keppler) نے سترہویں صدی کے اوائل میں حرکات سیارگاں کے حساب پر منطبق کیا۔[۷۴]

ریاضی کی بنیاد جب ایک بار اس ایقان پر رکھ دی گئی کہ اس مہیب پر اسرار کائنات میں ہر شئے ایک انتہائی باریک بین ریاضیاتی نظام پر قائم ہے تو پھر ریاضی کو سرّ کائنات کی نقاب کشائی کے عمل میں بنیادی کلّیہ بلکہ رأس الکلیہ کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ مسلم علماء نے اعلیٰ درجے کے ریاضیاتی مسائل پر اپنی بہترین دماغی صلاحیتیں صرف کیں۔ اب تک جو کچھ ناقابل تصور سمجھا جاتا تھا عملی طور پر ظہور پذیر ہونے لگا۔ مثال کے طور پر الماہانی کو لیجئے جس نے ریاضی کی تاریخ میں پہلی بار تیسرے درجے کی جبری مساوات وضع کی جسے وہ خود تو حل نہ کر سکا البتہ ابوجعفر الخازن نے اسے حل کر دکھایا۔ پانچویں صدی ہجری میں عمر خیام نے پہلی بار تیسرے درجے کی مساواتوں کا اصول اور حل پیش کیا البتہ وہ اس تشنگی کے ساتھ دنیا سے گیا کہ مطلق عددی حل (Absolute Numerical Solution) اس کی پہنچ سے دور رہ گیا ہے، کیا عجب مستقبل میں کوئی اور اسے ممکن کر دکھائے۔ کہا جاتا ہے کہ چھٹی صدی ہجری میں شرف الدین طوسی نے عددی حل معلوم کر لیا تھا۔[۷۵] بات یہیں ختم نہیں ہوگئی آنے والے دنوں میں یحییٰ المغربی (متوفی ۱۲۸۳ء) نے Roots of the Number کی دریافت کا طریقہ ایجاد کر ڈالا۔ اور پھر کوئی ڈیڑھ سو سال کے بعد غیاث الدین جمشید الکاشی (متوفی ۱۴۲۹ء) نے دائرے کے Circumference اور Radius کے تناسب کا پتہ لگا کر دنیائے ریاضی میں ہلچل بپا کر دی۔[۷۶]

عقل و اکتشاف کی اس غلغلہ انگیز تحریک نے قدیم طبّی تصورات کو بھی تقلیبِ فکر و نظر سے دوچار کر دیا۔ ابتداً اہلِ یونان کے طبّی علوم کو حرفِ آخر کی حیثیت حاصل تھی۔ جالینوسی نظامِ طب، جو اصلاً Hippocratus کا خوشہ چین تھا، اس مفروضے پر قائم تھا کہ تندرستی دراصل جسم میں پائے جانے والے چار مختلف قسم کے مائع مادّوں کے تناسب اور توازن سے عبارت ہے۔ ان چار رقیق مادوں کو جسے جالینوسی طب کی اصطلاح میں Humour کہا جاتا تھا دراصل عناصر اربعہ ہوا، پانی، آگ اور زمین کا عکاس سمجھا جاتا تھا۔ یہ خیال عام تھا کہ اگر ان کا توازن بگڑ جائے تو جسم بیمار ہو جاتا ہے۔

دوسری طرف عیسائی دنیا چرچ کے زیر اثر اس خیال کی قائل تھی کہ بیماری دراصل ایک طرح کا خدائی انتقام ہے۔ فنّی التباسات اور مذہبی توہمات کے اس ماحول میں مسلم علمائے اکتشاف نے دنیائے طب میں بھی تجربات و مشاہدات کی قندیل روشن کی۔ کہا جاتا ہے کہ جب بغداد میں مرکزی ہاسپٹل کا منصوبہ سامنے آیا تو اہل فن نے سب سے پہلے گوشت کے ٹکڑے شہر کے مختلف مقامات پر آویزاں کر دیئے پھر اس جگہ کو ہاسپٹل کے لیے منتخب کیا جہاں گوشت کے خراب ہونے کا عمل نسبتاً سست تھا۔ اس واقعہ سے کم سے کم اتنا تو پتہ چلتا ہی ہے کہ اس ابتدائی عہد میں بھی جب طبّ کی مروجہ کتابوں کا تحلیل و تجزیہ جاری تھا اور اس فن کی بنیاد رکھی جا رہی تھی، مسلم اطباء پر جرثومے کی دنیا بے نقاب ہو چکی تھی یا کم از کم وہ جرثومے کی مضرت رسانی سے واقف ہو چکے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ انھیں علمائے فقہ کو اس حقیقت پر قائل کرنے میں بسا اوقات دشواریوں کا بھی سامنا کرنا پڑتا تھا۔[۷۷]

نویں صدی عیسوی کی ابتداء میں ہی حُنین بن اسحاق، جو جالینوس کا پہلا عربی مترجم ہے، نے جالینوس کی بعض صریح غلطیوں کا اندازہ کر لیا تھا لیکن اسے معمولی ترمیم سے آگے ہمت نہ ہوئی۔ جالینوس کی Anatomy کا تو یہ حال تھا کہ اس کے بعض نقائص اہل فن پر واضح ہو گئے تھے لیکن کسی کی یہ ہمت نہ ہوتی تھی کہ اس سے انکار کرتا۔ عام رویّہ یہ تھا کہ اگر جالینوس نے یوں لکھا ہے تو یقیناً یہ سچ ہوگا خواہ مشاہدہ اس کی تردید کرتا ہو۔ البتہ رازی [Rahzes] (پ ۸۶۵) وہ پہلا شخص ہے جس نے اپنی کتاب شکوک لکھ کر جالینوس کے بت کو ہمیشہ کے لیے پاش پاش کر دیا۔[۷۸] رازی نے پہلی بار چیچک (Small Pox) اور خسرہ (Measles) کے فرق کو واضح کیا اور اس فن پر چند بنیادی کتابیں لکھیں۔ اس کے علاوہ اس نے جملہ امراض اور اس کے علاج پر مشتمل الحاوی کے نام سے تیئس جلدوں میں دنیائے طب کا ایک ایسا خزینہ مرتب کر ڈالا جس کی مثال اس سے پہلے انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ چوتھی صدی ہجری میں ابوالحسن الطبری نے خارش کا سبب اور اس کے جرثومے سے پہلی بار دنیا کو باخبر کیا۔[۷۹] ابن سینا نے تپ دق کے متعدی ہونے کی بات کہی،[۸۰] اور اسی صدی میں ابوالقاسم الزہراوی نے دموی امراض کا پتہ لگایا۔[۸۱] پانچویں صدی میں عبدالملک بن زہر نے دنیا کو غلافِ قلب کے اورام (Pericarditis) سے آگاہ کیا۔[۸۲]

الحاوی کی اشاعت کو ابھی ڈیڑھ صدی گذری ہوگی کہ ابن سینا نے اپنا نیا شہرہ آفاق مخزنِ طبی القانون فی الطب شائع کر دیا۔ ابن سینا کے القانون نے صدیوں شرق و غرب میں اہل فن کی رہنمائی کی اور مغرب کی دانش گاہوں میں کوئی پانچ چھ سو سالوں تک اسے طب کی ام الکتاب کی حیثیت حاصل رہی۔ ابن سینا کے ایک نوجوان معاصر ابوالقاسم الزہراوی [Albucasis] (متوفی ۱۰۱۳ء) نے کتاب التصریف لمن عجز عن التالیف کے نام سے تیس جلدوں میں ایک ایسے مخزن طبّی کی تالیف کی جس میں دنیائے طب کا عطر کشید کر لیا گیا تھا۔ اس کتاب کی چھبیس

جلدیں علم الادویہ سے متعلق تھیں جب کہ آخری جلد صرف سرجری کے لیے مختص کی گئی تھی۔ الزہراوی کا یہ کارنامہ چونکہ اندلس کی سرزمین پر انجام پایا تھا اس لیے مغربی دنیا پر اس کے اثرات فی الفور پڑے۔ کہا جاتا ہے کہ عمل جراحی کے بعض پیچیدہ مسائل جن کے حل کا سہرا مغربی اہل فن کے سر باندھا جاتا ہے واضح طور پر زہراوی کی کتاب میں موجود تھے۔ مثلاً بڑی نسوں سے خون بہنے کی روک تھام کا طریقہ جسے سولہویں صدی کے فرانسیسی جراح Ambroise Pare کا کارنامہ سمجھا جاتا ہے یا فن تولید میں جرمن طبیب Walcher (متوفی ۱۹۳۵ء) سے منسوب Walcher Position یا زخموں کی سلائی کے لیے Freiedrich Trendelenburg (متوفی ۱۹۲۴ء) سے منسوب ٹرنڈلنبرگ طریقہ — یہ تمام طریقے ابوالقاسم الزہراوی کے یہاں معروف تھے۔[۸۳]

تیرہویں صدی عیسوی میں ابن سینا کے بعض طبی تصورات پر شکوک وارد کئے گئے۔ ابن النفیس (پ ۱۲۱۳ء) نے انسانی نبض کے سلسلے میں پرانے تصورات کی نہ صرف یہ کہ نفی کی بلکہ القانون کے مقابلے میں علم طب کی ایک نئی درسی کتاب تیار کی جس نے جلد ہی عالم اسلامی میں القانون فی طب کی جگہ لے لی۔ ابن النفیس نے اپنی تالیف کتاب شرح تشریح القانون میں جالینوس کے اس خیال کی سختی سے تردید کی کہ قلب کے ایک حصہ سے دوسرے حصہ میں خون جانے کے لیے بیچ میں کوئی سوراخ بنا ہوتا ہے۔ ابن النفیس نے دنیا کو اس حقیقت سے متعارف کرایا کہ قلب

نویں صدی کا عالم اسلام: جب زراعتی انقلاب نے ایک انبساط انگیز کیفیت پیدا کر دی تھی۔

کے دائیں حصّے سے بائیں حصّے میں خون جانے کا کوئی اور راستہ پھیپھڑے کے علاوہ نہیں ہوسکتا۔ ابن النفیس کی اس دریافت کو نئی اصطلاح میں Pulmonary Transit کہا جاتا ہے۔ دیکھا جائے تو دورانِ خون کی دریافت کا سہرا جو ۱۶۲۸ء میں William Harvey کے سر باندھا گیا اس کا سرا تیرہویں صدی عیسوی میں ابن النفیس سے جا ملتا ہے۔

اکتشافی تمدّن کا قیام

نئے مسلم دماغ نے تحقیق و اکتشاف کی ایک ایسی غلغلہ انگیز تحریک برپا کی جس نے زندگی کے تمام ہی گوشوں کو ایک تقلیبِ مسلسل سے دوچار کئے رکھا۔ کائنات کی یہ نئی تفہیم جس کے مطابق دنیا اہل فکر کے لیے دعوتِ شوق ٹھہری اور جہاں یہ احساس مسلسل عام ہوتا رہا کہ ﴿ان فی اختلاف اللیل و النھار و ما خلق اللہ فی السمٰوات و الارض لآیات لقوم یتقون﴾ ایک ایسی ثقافت کے قیام پر منتج ہوا جو ظن وتخمین کے بجائے مشاہدے اور یقین سے غذا حاصل کرتا۔ خدا کی اس مہیب پراسرار کائنات کا مشاہدہ، اس کی تخلیقی نشانیوں پر غور وفکر، سنت اللہ کے اسرار سے کسی قدر آگہی اور ﴿سیروا فی الارض﴾ کی قرآنی دعوت نے مسلم ذہن کو ہر لمحہ اس احساس سے دوچار کئے رکھا گویا تسخیر و اکتشاف کا یہ عمل ایک انبساط انگیز مگر کبھی نہ ختم ہونے والا سفر ہو کہ

آ رہی ہے دمادم صدائے کن فیکوں

گذشتہ صفحات میں ہم نے یہ دکھانے کی کوشش کی تھی کہ استخراجی سے استقرائی منہج علمی کی تبدیلی نے کس طرح علمائے متقدمین کے مسلّمات کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ ساسانی، ہندی، اور یونانی علوم جب تجربہ اور مشاہدہ کی کسوٹی پر بار بار پرکھے گئے تو بڑے بڑے اساطینِ وقت کا اعتبار جاتا رہا۔ بطلیموس ہوں یا جالینوس، ارسطو ہوں یا اقلیدس جن کے علمی دبدبے نے صدیوں سے تلاش حق کی راہ مسدود کر رکھی تھی، وہ اس نئے منہج علمی کی تاب نہ لا سکے۔ مشاہدے کی یہ لَے مسلسل تیز ہوتی رہی یہاں تک کہ ﴿سیروا فی الارض﴾ کی قرآنی دعوت نے بعض مہم جو نوجوانوں کو، خدا کی یہ دنیا جیسی کہ وہ ہے، اسے خود اپنی آنکھوں سے دیکھنے پر مہمیز کیا۔ اس سلسلے میں ابن جبیر (متوفیٰ ۱۲۱۷ء) اور ابن بطوطہ (متوفیٰ ۱۳۷۷ء) کے نام آج بھی اساطیری اہمیت کے حامل ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ۱۳۲۵ء میں ابن بطوطہ جو اس وقت اکیس سال کا ایک نوجوان تھا حج کے سفر پر روانہ ہوا۔ چوبیس سال بعد جب گھر واپس آیا تو وہ عالم عرب، مصر، شام، عراق، ہندوستان، روس، افریقہ، چین، اور سماترا کی سیر کر چکا تھا۔ ابن جبیر اور ابن بطوطہ کے سفرناموں نے دنیائے شوق کا آنکھوں دیکھا حال پیش کیا۔ اس طرح مختلف اقوام وتہذیب کے بارے میں

نویں صدی عیسوی میں جامع قرطبہ کے منارہ سے ابن فرناس کا پہلا ہوائی سفر

پہلی مرتبہ دنیا کے سامنے شخص واحد کا مصدقہ تجربہ سامنے آیا۔ ابوالفدا (متوفی ۱۳۳۱ء) نے پہلی بار اس امر کا انکشاف کیا کہ دنیائے شوق کے سفر میں جب مسافر ایک سمت سے دوسری سمت کا سفر کرتا ہے تو اسے دنوں کے گھٹنے بڑھنے اور کبھی اچانک وقت کے ٹھہر جانے کا احساس ہوتا ہے۔ یاقوت الحموی (متوفی ۱۲۲۹ء) نے معجم البلدان لکھ کر دنیا کے تقریباً تمام ہی معروف شہروں میں کیا کچھ ہو رہا ہے اور کہاں کیسے لوگ آباد ہیں، ایک ایسا جام جہاں نما فراہم کر دیا جہاں بیک نظر اقوام عالم کی تمام تر جلوہ نمائیوں کو ملاحظہ کیا جا سکتا تھا۔

معاصر دنیا سے عملی آگہی، سفر کا شوق، مخازن علمی کی اشاعت اور سب سے بڑھ کر یہ کہ عالمِ اسلام کی وسیع سرحدوں کے اندر، جس میں متمدن دنیا کا غالب حصہ شامل تھا، اکتساب و استفادے کی عمومی لہر نے انسانی تہذیب کو ایک ایسی تجربہ گاہ فراہم کر دی تھی جہاں بیک وقت مختلف خطّوں کے علوم اور مختلف ثقافتوں کے ماحصل کا ارتکاز نظر آتا تھا۔ مثال کے طور پر اہل اُندلس کی زراعتی تکنیک نے، جہاں سال میں کئی فصلوں کا رواج تھا، اہل عراق کو ایک سے زیادہ فصل کی راہ دکھائی۔ اہل ایران جن کے یہاں نہروں کے ذریعے آبپاشی اور نشیبی زمینوں سے اوپر پانی پہنچانے کی روایتی تکنیک تھی، وہ اہل عراق اور اہل شام کے کام آئی۔ مختلف قسم کے پھل ایک علاقے سے دوسرے علاقوں میں متعارف ہوئے۔ اس طرح دیکھتے دیکھتے ایک زراعتی انقلاب نے پورے عالم اسلام کو اپنی انبساط انگیز آغوش میں لے

خوشحالی کے اس ماحول نے، جس کا احساس آٹھویں صدی عیسوی سے ہونے لگا تھا اہل اکتشاف کے لیے ایک سازگار ماحول فراہم کیا۔ فرصت کے اس ماحول میں اہل فن نے بعض ایسی ایجادات بھی پیش کیں جن کا مقصد بظاہر تو عقل کو حیران کرنا تھا لیکن فی الاصل یہ اس خیال کی داعی تھیں کہ کائنات کے بعض قوانین کی بنیادی تفہیم سے ایک نئے عالم طلسم کا قیام ناممکن نہیں۔ بنوموسیٰ جو تاریخی مصادر میں ایک ماہر مشین ساز کی حیثیت سے متحرک نظر آتے ہیں ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے خودکار کھلونوں کی ایک دنیا آباد کر دی تھی۔ رنگ بدلتے فوارے، خودکار سریلی بانسریاں حتیٰ کہ چھوٹی سی روبوٹ لڑکی جو آپ کی خدمت میں چائے پیش کر سکے۔[۸۴] گیارہویں صدی عیسوی میں اسپین کے شہر طلیطلہ میں الزرقالی (Arzachel) نے ایک ایسی آبی گھڑی بنائی جو وقت بتانے کے ساتھ ساتھ چاند کی گردش سے بھی مطلع کرتی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ کئی صدیوں تک یہ گھڑی طلیطلہ کے عجائبات میں شمار ہوتی رہی یہاں تک کہ ایک ماہر فن نے اس کا راز جاننے کے لیے اسے کھول کر دیکھا اور پھر دوبارہ اسے اپنی اصل حالت پر قائم نہ کر سکا۔[۸۵]

نزول وحی کے پیدا کردہ اس عالم اکتشاف نے عام ذہنوں کو جس اعتماد سے آشنا کیا تھا اس کا کسی قدر اندازہ اُن علمی اور تجرباتی سرگرمیوں سے ہوتا ہے جو مسلسل ان صدیوں میں مختلف بلاد و امصار میں ہوتی رہیں۔ یہ احساس عام ہو چلا تھا کہ خدا کی اس کائنات میں جو انسانوں کے لیے تسخیر کی گئی ہے قوانین فطرت سے آگہی ناممکن کو ممکن بنا سکتی ہے۔ بحر و بر کی تسخیر، خشکی و تری پر انسانوں کی چلت پھرت کے مناظر تو دنیا نے بہت دیکھے تھے، نویں صدی عیسوی کے شہر قرطبہ میں عباس بن فرناس نے انسانی تاریخ میں پہلی بار ہوائی سفر کا منصوبہ بنایا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک دن اس نے اچانک جامع قرطبہ کے ایک بلند منارہ سے چھلانگ لگا دی۔ اس نے پیراشوٹ جیسی کوئی چیز پہن رکھی تھی۔ اس تجربہ سے حوصلہ پا کر اس نے دوسری بار بازکی ساخت کا ایک لکڑی کا فریم بنایا۔ وقت مقررہ پر ایک جم غفیر اس تماشے کو دیکھنے کے لیے جمع ہو گیا۔ اس نے بلندی سے اڑان بھری کوئی دس منٹ تک ہوا میں چکر لگانے کے بعد اس کا جہاز زمین میں آ گرا، اس کی پشت مجروح ہو گئی۔ دوبارہ اس ستّر سالہ بوڑھے کو مزید تجربے کا موقع نہ مل سکا۔[۸۶]

تحریک اکتشاف کے عمومی غلغلے نے صرف مسلم ذہن کو ہی متاثر نہیں کیا بلکہ غیر مسلم علماء و مفکرین بھی اس تحریک کا حصّہ بن گئے۔[۸۷] ابتدائی صدیوں میں جب مسلم ریاست کی سرحدیں مسلسل وسیع ہوتی جاتی تھیں عددی اعتبار سے مسلمان اقلیت میں تھے۔ البتہ ان کے اکتشافی طرز فکر نے فکری اور علمی سطح پر پورے معاشرے کو اپنے دائرۂ اثر میں سمو لیا تھا۔ رنگ و نسل، زبان و زمان اور مذہب و ملت کے سارے امتیاز سے بالاتر ہو کر پورا معاشرہ اس تحریک میں شریک تھا۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ اس عظیم الشان مہم کی قیادت اہل ایمان کے ہاتھوں میں تھی۔ تب متبعین محمدؐ اس یقین واثق کے حامل تھے کہ انھیں غیاب پیمبری میں اقوام عالم کی سیادت یا ﴿شهداء على الناس﴾ کی ذمہ داری سونپی گئی ہے اور اس لیے رازِ

کائنات کی بے نقابی اور اس کی اطلاقی منصوبہ بندی ان کے ملی منشور کا حصّہ ہے۔ رہے وہ لوگ جو اس ہزار سالہ اکتشافی تحریک کے باوجود جس نے مغرب کے عہد تاریک کو روشنی بخشی اور آج بھی جس کی بنیادوں پر جدید سائنسی تہذیب کا چراغ روشن ہے، یہ کہتے نہیں تھکتے کہ اسلام میں سائنس کے پنپنے کے امکانات معدوم ہیں تو وہ دراصل بدترین قسم کے تعصب اور سخت ناواقفیت کا شکار ہیں۔[۸۸]

گذشتہ صفحات میں ہم قدرے تفصیل سے بیان کر چکے ہیں کہ عالم اسلامی میں ہر دور میں تحریک اکتشاف کی کمان جن لوگوں کے ہاتھوں میں رہی ہے وہ وحی ربانی کا گہرا شعور رکھتے تھے۔ ان میں سے بیشتر لوگوں نے تفسیر و تاویل اور فقہ و کلام جیسے روایتی دینی علوم پر باضابطہ کتابیں تصنیف کی ہیں۔ حتیٰ کہ وہ اہم اکتشافی کتابیں جو علومِ اکتشاف میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں اور جن کی اشاعت نے ہماری تہذیب کو تقلیب فکر و نظر سے دوچار کیا ہے ان کے ابتدائی صفحات اس بات پر گواہ ہیں کہ مصنف نے ان کتابوں کو خالص دینی جذبے سے تحریر کیا ہے جن پر وہ خدا سے بہترین اجر کے طالب رہے ہیں۔ اگر مسلمان اس عمل کو اپنا فریضہ منصبی نہ سمجھتے تو اس تحریک کے پیچھے عوامی تائید کا فقدان ہوتا۔ پھر نہ تو عباسی بغداد میں بیت الحکمة کا علامتی ادارہ وجود میں آتا اور نہ ہی اتنے بڑے پیمانے پر تاریخ کے مختلف ادوار میں رصدگاہوں اور تجربہ گاہوں کی ریت قائم ہوتی۔ حتیٰ کہ فقہی التباسات کے اس عہد نمناک میں بھی جب کلامی فقہ کے مجادلوں سے امت کا وجود لہولہان تھا، ایک فقہی گروہ دوسرے کا خون بہانا مباح سمجھتا، رصدگاہوں اور تجربہ گاہوں پر عوامی تادیب کی کوئی روایت نہیں ملتی۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ان علمی اور اکتشافی سرگرمیوں کو حکمراں اپنے سیاسی جواز پر محمول کرتے جس کا ایک بیّن ثبوت خود عہد عباسی میں بیت الحکمة کا قیام بھی ہے۔

ہمارے مورخین نے بیت الحکمة کے بیان کو غیر معمولی اہمیت دے رکھی ہے۔ اس کا ایک سبب تو شاید یہ ہے کہ جہاں دمشق کی جامع اموی کی علمی سرگرمیاں بنوامیہ کے زوال کے سبب حاشیہ پر چلی گئیں وہیں دارالحکمة کے موسسین کی حکومت کا سلسلہ کوئی پانچ سو سالوں تک چلتا رہا جس کے اثرات تاریخ نگاری پر پڑنا فطری تھے۔ نزول وحی کے بعد تسخیر و اکتشاف کا جو عمومی غلغلہ بلند ہوا تھا اس نے مختلف بلاد و امصار میں رصدگاہوں، لائبریریوں اور علمی مجالس کا جال بچھا دیا تھا۔ عالم اسلام کا کوئی ایسا قابل ذکر شہر نہ تھا جہاں چوٹی کے علماء و مفکرین کا ایک قابل ذکر گروہ نہ پایا جاتا ہو۔ اہل فن کی اس کثرتِ تعداد کے سبب ہی یاقوت الحموی (۱۱۷۹ء—۱۲۲۹ء) کو مختلف سوانحی معاجم مثلاً معجم الادباء، معجم الشعراء اور اخبار الشعراء وغیرہ مرتب کرنے کی تحریک ملی۔

کہا جاتا ہے کہ دمشق میں اموی حکمرانوں نے جو پہلی باضابطہ لائبریری قائم کی اس میں اس عہد کا تمام علمی سرمایہ جمع کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ طب، الکیمی اور اجنبی زبانوں میں مختلف علوم کے مخطوطات ہر خاص و عام کے استفادے

کے لیے مہیا کرا دیئے گئے۔ آگے چل کر جب فاطمیوں نے مصر میں ایک نئی خلافت کی بنیاد رکھی تو ان کی اسکیم میں بھی لائبریریوں کو خصوصی اہمیت حاصل رہی۔ کہا جاتا ہے کہ فاطمی خلیفہ العزیز کے عہد میں صرف علومِ عہدِ قدیم سے متعلق کتابوں کے لیے چالیس کمرے مختص کئے گئے تھے۔[۸۹] عوامی زندگی میں کتابوں نے کس قدر اہمیت اختیار کر لی تھی اس کا کسی قدر اندازہ اس واقعہ سے ہوتا ہے کہ ۱۲۳۴ء میں بغداد میں جب مدرسہ مستنصریہ کا قیام عمل میں آیا تو خلیفہ نے اپنے ذاتی کتب خانے سے اسے اَسّی ہزار کتابیں مرحمت فرمائیں۔ مسجد جسے مسلمانوں کی سماجی زندگی میں کلیدی اہمیت حاصل رہی ہے لائبریری کے بغیر مکمل نہیں سمجھی جاتی تھی جہاں مختلف امور پر ہمہ دم علمی مناقشوں کا سلسلہ جاری رہتا۔ دمشق، بغداد اور قاہرہ کے تذکروں سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ بڑی لائبریریوں کی سہولت صرف دارالخلافہ یا بڑے شہروں تک محدود تھی۔ دسویں صدی عیسوی کے شیراز میں ایک ایسی لائبریری کا تذکرہ ملتا ہے جو تین سو ساٹھ کمروں پر مشتمل تھی اور جس کے اردگرد نہروں اور باغات کا دلفریب سلسلہ قائم تھا۔[۹۰] صرف مَرو کے شہر میں، جیسا کہ یاقوت نے لکھا ہے، تیرہویں صدی عیسوی میں دس عظیم الشان لائبریریاں تھیں۔ بغداد جو مدرسوں کا شہر سمجھا جاتا تھا اور جہاں اس وقت تیس مدرسے قائم تھے ہر مدرسے کی اپنی الگ لائبریری ہوا کرتی تھی۔[۹۱] کہا جاتا ہے کہ تیرہویں صدی عیسوی کے مصر میں جب القاضی الفاضل نے ایک مدرسہ قائم کیا تو اس نے اس مدرسے کو خود اپنی طرف سے ایک لاکھ کتابوں کا عطیہ دیا۔[۹۲] اس صورتِ حال کا موازنہ اگر اس وقت کی دوسری لائبریریوں سے کیجئے تو اس لائبریری کلچر کی اہمیت سمجھ میں آتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پیرس کی مشہور زمانہ سوبون یونیورسٹی کی لائبریری میں چودھویں صدی عیسوی میں صرف دو ہزار کتابیں پائی جاتی تھیں جبکہ ویٹیکن کی مرکزی لائبریری پندرھویں صدی عیسوی میں کل دو ہزار دو سو ستاون (۲۲۵۷) کتب پر مشتمل تھی۔[۹۳]

سماجی زندگی میں لائبریریوں کو مسجد کے ساتھ مرکزی اہمیت مل جانے اور تعلیم و تعلّم کی اس عمومی فضا کے قیام میں کاغذ کی صنعت نے اہم رول ادا کیا۔ ابتدائے اسلام میں چرمی اوراق یا رقِ المنشور (Papyrus) کے استعمال کا رواج عام تھا جس کے سبب کتابیں خواص کے حلقے تک محدود تھیں۔ آٹھویں صدی عیسوی کے وسط میں بغداد میں پہلی کاغذ کی فیکٹری قائم ہوئی۔[۹۴] جلد ہی اس صنعت کو اتنا فروغ ہوا کہ بغداد کے بازار کاغذ فروشوں اور اسٹیشنری کے ساز و سامان سے بھر گئے۔[۹۵] کہا جاتا ہے کہ بغداد میں صرف لکھنے پڑھنے کی اشیاء کے لیے ایک پورا بازار وجود میں آ گیا تھا جسے سوق الورّاقین کے نام سے جانا جاتا تھا۔ کاغذ کی یہ عام دستیابی گویا اس بات کا اعلان تھا کہ اب تک علم و فن کی جو دنیا صرف خواص کے لیے محدود تھی اب اس کے دروازے عامۃ الناس پر وا کر دیئے گئے ہیں۔

خلاصۂ بحث

قرآنی دعوتِ تسخیر و اکتشاف نے علم کی جو عمومی تحریک پیدا کی تھی وہ فکری اور سماجی طور پر اس حد تک مسلم معاشرے کا حصّہ بن گئی تھی کہ اس پر سیاسی انقلابات کے اثرات کم ہی پڑتے تھے۔ خلافتیں تاراج ہوتیں، حکمراں تبدیل ہوتے لیکن علم وفن کی شمع تابندہ رہتی۔ خلافت راشدہ کا سیاسی سفر، سفرِ معکوس میں مبتلا، عباسی بغداد، فاطمی مصر اور اموی اسپین میں انتشار کا شکار ہوا لیکن مسلم ذہن کی تابانی، اجنبی علوم کی تنقیح وتنقید اور سرّ کائنات کی نقاب کشائی میں مشغول رہی کہ اب مسلم تہذیب نے 'صورتِ خورشید' جینے کا فن سیکھ لیا تھا۔ بغداد پر زوال آیا تو قرطبہ چمکنے لگا اور جب اسپین میں امویوں کا چراغ گل ہونے لگا تو دمشق، استنبول، تاشقند، سمرقند، بخارا، کابل، قاہرہ، دہلی اور نہ جانے کتنے شہر ہماری تہذیبی فتوحات کا علامیہ بن گئے۔

قرآن مجید کی دعوتِ فکر بالآخر سرّ کائنات کی بے نقابی پر منتج ہوئی۔ ابتداء میں تو مسلمانوں نے ساسانی، یونانی اور ہندی مآخذ سے ملنے والی دانشِ انسانی سے بھرپور اکتساب کی کوشش کی لیکن علم وحکمت کی اس تنگ دامانی کا جب انھیں اندازہ ہوا تو پھر وہ مشاہدے اور تجربے کی راہ پر چل نکلے۔ وہ علمی مفروضات جس کی صداقت تجربات ومشاہدات سے نہ ہوتی ہو نا قابل اعتنا قرار پائے۔ بطلیموسی نظام اور دانشِ یونانی جسے عیسائیت نے معتبر قرار دے رکھا تھا اور جو صدیوں سے انسانی فکر کی پیش قدمی میں مزاحم تھے بالآخر بڑی ردّ وکد اور تحقیق وجستجو کے بعد مسترد کر دیئے گئے۔ جس دن ابن الہیثم نے بطلیموسی نظام کی صداقت پر اعتراض وارد کر دیا تھا تو بس سمجھ لیجئے کہ اسی دن جدید سائنس کی بنیاد رکھ دی گئی تھی۔ آگے چل کر جب مراغہ کی رصدگاہوں میں منہمک ماہرین فلکیات نے مشاہدے کو علم کائنات کی اساس قرار دے ڈالا اور جس کے نتیجے میں ابن شاطر کی تصنیف کتاب نهاية السول فی تنقيح الاصول وجود میں آئی تو علمائے فن اس اعتماد سے سرشار ہو گئے کہ انھوں نے مستقبل کی علمی اساس کا بڑا کارنامہ انجام دے ڈالا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ابن شاطر کا یہ کارنامہ کوئی ڈیڑھ سو سال بعد جب کوپرنکس کے حوالے سے مغرب میں عام ہوا اور بعد کی تحقیقات نے ان اساس پر ایک نئی دنیا تعمیر کر ڈالی تو کچھ تو تعصب اور کچھ بے خبری کے سبب مغرب اس خیال سے غافل رہا کہ سر کائنات کی بے نقابی کا سرا اس قرآنی دائرۂ فکر میں پایا جاتا ہے جس نے کائنات پر غور وفکر کو ایک مذہبی فریضے کی حیثیت دے رکھی ہے۔ گو کہ ارسطو کی کتابوں کے تراجم نے مسلم ذہن کو وقتی طور پر مخمصے میں ڈال دیا تھا۔ ایسا اس لیے کہ علوم کا یونانی تصور اولاً خاصا محدود تھا۔ نیچرل فلاسفی جسے بسا اوقات فزکس کا نام بھی دیا جاتا تھا، کے علاوہ میٹافزکس اور میتھمٹکس پر تمام علوم کا احاطہ ہو جاتا تھا۔[۹۶] دوسری طرف ارسطاطالیسی تصور کائنات میں دنیا کو ایک ازلی ابدی حقیقت کی حیثیت

سے تسلیم کیا جاتا تھا۔ خدا کے ساتھ ساتھ کائنات کے قدیم ہونے کا تصور قرآنی دائرۂ فکر سے مغائر تھا۔ ابتداً مسلم اہل فکر کے لیے ان خیالات سے مطابقت پیدا کرنا یا انھیں یکسر مسترد کرنا خاصا دشوار ثابت ہوا۔ البتہ جب کائنات پر غور و فکر کے لیے عقلی اور سائنسی بنیادیں مستحکم ہوتی گئیں تو نہ صرف یہ کہ کائنات کے بارے میں یونانی تصورات پس پشت چلے گئے بلکہ علوم کی یونانی روایتی تقسیم اکتشافی عمل کے لیے ناکافی محسوس ہونے لگی۔ مثال کے طور پر ابن الہیثم نے جب کتاب المناظر لکھی یا البیرونی نے کتاب تحدید نهاية الأماكن تصنیف کی تو انھیں اس بات کا اندازہ تھا کہ وہ علوم کی بالکل ہی نئی شاخوں کی بنیاد رکھ رہے ہیں۔ اس عہد کی تصنیفات پر ایک نگاہ ڈالئے تو حیرت ہوتی ہے کہ جن باتوں کے اب تک صرف عمومی اور سرسری تذکرے کو دانش کی معراج سمجھا جاتا تھا ان پر بہت قلیل عرصے میں باضابطہ تخصیصی کتابیں لکھی جانے لگیں۔ کوئی کتاب علم الهندسه لکھ رہا ہے تو کوئی کتاب الجبر والمقابلة لکھنے میں مصروف ہے اور کسی کا شوقِ تحقیق اسے کتاب النجوم کی تصنیف پر آمادہ کر رہا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ بعض مسلم اہل علم ارسطو سے خاصے متاثر رہے[۹۷] البتہ عالم اسلام کے مجموعی ماحول پر قرآنی تصور کائنات اور مذہبی جذبۂ شوق و تحقیق غالب رہا۔ اور اگر مامون کے اس خواب[۹۸] کو بھی اس پس منظر میں رکھئے جو اس نے ارسطو سے متعلق دیکھا تھا تو اس بات کا سمجھنا دشوار نہیں رہتا کہ ابتدائی ایام میں یونانی علوم و دانش کو بنیادی طور پر مسلم دائرۂ فکر کے معاون کے طور پر دیکھا جاتا رہا۔

بعض مفکرین اس غلط فہمی کا شکار رہے ہیں کہ جدید سائنس خالصتاً مغرب کی ایجاد ہے۔[۹۹] وہ اس بات پر حیرت کا اظہار کرتے ہیں کہ عہد وسطیٰ میں عالم اسلام اپنی تمام تر علمی اور فکری ترقی کے باوجود جدید سائنس کے پیدا کرنے میں ناکام رہا۔ ان حضرات کے خیال میں اسلام کی کچھ ساخت ہی ایسی ہے کہ وہاں غور و فکر اور مشاہدہ و ایجاد کی بیل منڈھے نہیں چڑھتی۔ زوال کی صدیوں میں مسلمانوں کے لیے اس قسم کی جلی کٹی باتیں اور فارق الحقائق الزامات کچھ نئے نہیں رہے ہیں۔ ان معترضین سے یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ اولاً اگر قدمائے یونان کی کتابیں عربی سے لاطینی میں ترجمہ ہو کر ان تک نہ پہونچتیں تو کیا وہ (مفروضہ) جدید سائنس کی بنیاد رکھنے میں کامیاب ہو جاتے؟ ثانیاً علمائے یونان کے عربی تراجم اس ثبوت کے لیے کافی ہیں کہ اسلامی تہذیب میں علم و حکمت کی بالیدگی کی خاصی گنجائش موجود رہی ہے۔ ثالثاً قدمائے یونان کی کتابیں اگر ایک علمی سائنسی انقلاب کے لیے کافی تھیں تو پھر ان کتابوں نے، جب وہ اپنی اصل شکل میں رومی سلطنت کے علاقوں میں موجود تھیں، کوئی سائنسی انقلاب کیوں نہیں پیدا کیا؟ رابعاً آخر کیا وجہ تھی کہ ساسانی، رومی اور ہندی مآخذ سے آنے والے علم و فن اپنی اصل سرزمینوں میں وہ نتائج نہ پیدا کر سکے لیکن جب قرآنی دائرۂ فکر میں انسانی تہذیب کے اس علمی ورثے کو تحلیل و تجزیے کا موضوع بنایا گیا تو ایک انقلاب آ گیں کیفیت پیدا ہو گئی؟ خامساً مسلمانوں نے دانشِ یونانی کے التباسات کو وحی ربّانی کی روشنی میں اور اپنے تجربے اور مشاہدے کے ذریعے

مسلسل چاک کرنے کی کوشش کی۔اس عمل میں وہ گاہے بگاہے التباسات کا شکار تو ہوئے اور کبھی ایسا بھی لگا گویا قرآنی دائرۂ فکر دانشِ انسانی سے متصادم ہو گیا ہو لیکن بالآخر وحی ربّانی نے ان کی دستگیری کی اور وہ اکتشاف وتسخیر کی راہ پر آگے بڑھتے گئے۔عہدِ وسطیٰ میں جب مغربی ذہن پر چرچ کی بند دماغی کا تسلط قائم تھا اور جب انسانی ذہن اپنے ہی پیدا کردہ التباسات ومفروضات کا اسیر بن کر رہ گیا تھا اور جب اس تعذیب انگیز گھٹن سے نجات کی کوئی راہ دکھائی نہ دیتی تھی اس وقت عربی کتابوں کے لاطینی ترجمے اہلِ مغرب کے لیے آخری منارۂ نور کی حیثیت رکھتے تھے،جس سے چھن کر آنے والی روشنی ان کی علمی مجلسوں کی رونق قائم رکھتی۔گویا آج مغرب ہی کیا ساری دنیا میں علم وفن کے جو مظاہر دیکھنے میں آتے ہیں ان سب کی اساس اسی قرآنی دائرۂ فکر میں پائی جاتی ہے جس نے کائنات پر غور وفکر کو ایک مذہبی فریضہ کی حیثیت دی اور پھر تمام علوم حاضرہ اور متقدمہ سے اکتساب کا فن سکھایا۔ الحکمة ضالة المومن کی پیدا کردہ فضا میں اس تعصب یا تنگ نظری کی کوئی گنجائش نہ تھی کہ علم وفن کا ماخذ ہندی ہے یا چینی،رومی ہے یا ساسانی۔ان حقائق کی موجودگی میں یہ کہنا کہ جدید سائنس خالصتاً مغرب کی پیداوار ہے تاریخی حقائق سے انکار ہی نہیں تعصب پر مبنی ایک گمراہ کن پروپیگنڈہ ہے۔رہی یہ بات کہ جس عالم اسلام نے تہذیب انسانی کے فکری سفر کو ایک غلغلہ انگیز سائنسی تجربے سے دوچار کیا،جس نے صدیوں سے حاوی بطلیموسی نظام کی اینٹ سے اینٹ بجا کر رکھ دی اور جس نے طب،ہندسہ، ریاضی،ہیئت اور دیگر علوم کو ان خطوط پر منظّم کیا جن پر آج بھی ہمارا سفر جاری ہے،آخر کیا وجہ تھی کہ خود اسی عالمِ اسلامی میں اکتشاف وتسخیر کا قافلہ رفتِ خرام کا شکار ہو گیا جب کہ ان ہی کتابوں کے تراجم نے مغرب میں ایک نئی دنیا تعمیر کر ڈالی۔یہ سوال فی نفسہٖ انتہائی اہم ہے جس پر ہم اگلے باب میں اظہارِ خیال کریں گے۔

تعلیقات وحواشی

۱۔ محمد بن اسحاق بن یسار، سیرت ابن اسحاق، تحقیق وتعلیق محمد حمیداللہ، ترجمہ نور الٰہی ایڈوکیٹ، نئی دہلی ۲۰۰۰ء ص۱۵۰۔

۲۔ گوکہ بت پرستی کے ذریعہ سماجی نظام کو ایک تقدس عطا کرنے کی کوشش کی گئی تھی لیکن اس خلاء کا احساس بھی پایا جاتا تھا کہ بت پرستی ایک فلسفۂ حیات کی حیثیت سے کائنات اور فطرت کے سلسلے میں بنیادی سوالات کا کوئی تشفی بخش جواب فراہم کرنے سے قاصر ہے۔ پھر عام زندگی میں بھی بتوں کا احترام یا مسلّمہ معروف کی پاسداری اسی وقت تک کی جاتی تھی جب تک ان سے مطلب براری کا امکان پایا جاتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ امراء القیس نے اپنے باپ کے انتقام کے سلسلے میں اپنے بت سے اجازت حاصل کرنے کی تین مرتبہ کوشش کی لیکن جب اسے لگاتار مطلوبہ اشارے حاصل نہ ہوئے تو اس نے یہ کہتے ہوئے اپنی راہ لی کہ اگر اس بت کے اپنے باپ کا معاملہ ہوتا تو یقیناً اس سرد مہری کا مظاہرہ نہ کرتا۔ اصنام پرستی کے سلسلے میں اس قدر غیر سنجیدہ رویّے کی ایک وجہ تو دین حنیف یا دین ابراہیمی کا وہ پس منظر تھا جس کے باقیات کی تلاش کو مستحسن خیال کیا جاتا اور جس کی طرف ایک رومانی رویہ پایا جاتا تھا اور دوسرا سبب یہ تھا کہ اصنام پرستی مکہ کے تاریخی کلچر کا حصہ نہیں تھی اسے بہت بعد کے عہد میں مکہ کے بعض سردار شام سے لے کر آئے تھے جہاں یہ خیال عام تھا کہ ان کی موجودگی سے بارش ہوتی ہے اور دشمنوں پر فتح پانا آسان ہوجاتا ہے۔ (ابن الکلبی، کتاب الاصنام، تعلیق احمد عبید ومحمد احمد، قاہرہ ۱۹۹۳ء، ص۸)۔

الازرقی نے لکھا ہے کہ مکہ کا ایک باشندہ عمرو بن لحیی جب سرزمین عراق کے سفر پر گیا تو وہ اپنے ساتھ ہبل کا ایک بت بھی لایا جس نے رفتہ رفتہ قریش کے نظامِ اصنام میں اتنی اہمیت اختیار کر لی کہ اسے عین کعبہ کے اندر اس گڑھے میں نصب کر دیا گیا جس کے بارے میں یہ خیال عام چلا آتا تھا کہ اسے حضرت ابراہیم نے خود اپنے ہاتھوں سے کھودا تھا۔ بہت جلد یہ روایت قائم ہوگئی کہ جو کوئی بھی سفر سے واپس آتا وہ اپنے گھر کا رخ کرنے کے بجائے سب سے پہلے اس بت کی زیارت کرتا۔ کہا جاتا ہے کہ احد کی جنگ میں ابوسفیان نے اپنے رجزیہ کلمات

میں جبل کی اسی مفروضہ عظمت کا حوالہ دیا تھا: اعل یا ھبل (یعنی ہبل کی جے)۔ جس کے جواب میں رسول اللہ کے خیمے سے یہ آواز آئی: اللہ اعلی و اجل۔ ہبل کو اہل قریش کے سب سے بڑے بت کی حیثیت حاصل تھی جس کے اشارے نازک لمحات میں فیصلہ کن سمجھے جاتے۔ مثال کے طور پر جب کسی بچے کی ولدیت باعث نزاع بن جاتی تو اس کا فیصلہ ہبل کے تیروں سے کیا جاتا اور پھر جو کچھ بھی جواب برآمد ہوتا اسے من وعن قبول کر لیا جاتا۔ ایک ایسے معاشرے میں جہاں راستے مسدود ہونے کا گہرا احساس پایا جاتا تھا اور جہاں حق و باطل، حلال وحرام کی تمیز مشکل ہوگئی تھی، ہبل کی حیثیت آخری پناہ گاہ کی تھی۔

۳۔ ابن کثیر، البدایۃ والنھایۃ، ج ۳، ص ۱۴-۱۲۔

۴۔ عام طور پر سیرت نگاروں نے تجربۂ وحی کے سلسلے میں بخاری کی آغاز وحی والی روایت کو ہی اپنا محور ومرکز بنایا ہے۔ ہمارے خیال میں اس روایت میں بعض تفصیلات زیب داستاں کے قبیل سے تعلق رکھتی ہیں۔ مثال کے طور پر یہ کہ آپؐ کو اپنی جان کا خطرہ ہوگیا: لقد خشیت علی نفسی جس کے جواب میں حضرت خدیجہؓ کو یہ تسلی دینا پڑی: کلا ابشر فواللہ ما یخزیك اللہ ابدا انك لتصل الرحم و تصدق الحدیث تحمل الکل و تکسب المعدوم و تقری الضیف و تعین علی نوائب الحق (رواہ البخاری)

بلکہ اس روایت کے مطابق تو آپؐ کو اس تجربے کی صحیح ماہیت کا بھی اندازہ نہ تھا وہ تو خدا بھلا کرے حضرت خدیجہ کا کہ وہ آپؐ کو لے کر اپنے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس پہنچیں جنھوں نے آپؐ کی زبانی واقعہ کی تفصیل جاننے کے بعد یہ یقین دلایا کہ ھذا الناموس الذی نزل اللہ علی موسیٰ کہ یہ وہی فرشتہ ہے جو حضرت موسیٰ پر نازل ہوا تھا۔ ہمارے خیال میں محمد رسول اللہ کی نبوت کو سند فراہم کرنے کے لیے ورقہ بن نوفل کی تصدیق زیب داستاں سے زیادہ نہیں۔ تاریخ وروایت کی دوسری کتابوں میں اس واقعہ کی تفصیلات سے بھی ہمارے خیال کی تائید ہوتی ہے۔

حافظ ابن عساکر نے سلیمان بن طرخان تیمی کے حوالے سے لکھا ہے کہ غارِ حرا کے تجربے کے بعد جب حضورؐ حضرت خدیجہؓ کے پاس تشریف لائے تو فرمایا: یا خدیجۃ ارایت الذی کنت اری فی المنام و الصوت الذی کنت اسمعونی الیقظۃ و اھال منہ فانہ جبریل قداستعلن و اقرأنی کلاما فزعت منہ ثم عاد الیّ فاخبرنی انیّ نبی ھذہ الامۃ۔

واقعہ نزول کے گرد اساطیری ماحول کی تعمیر میں ان روایتوں کا بھی بڑا دخل ہے جسے بعض سیرت نگاروں نے بلاتحقیق وتجزیہ اپنی تالیفات میں جگہ دے دی اور جس نے گزرتے وقتوں کے ساتھ نقل در نقل کے مرحلے میں استناد کا درجہ حاصل کر لیا ہے۔ ان روایتوں پر اگر اعتبار کر لیا جائے تو وحی اور تفویض نبوت جیسے قطعی اور حتمی واقعات پر محض ہلوسہ کا گمان ہوتا ہے۔ ہم یقیناً ان سیرت نگاروں کے دلوں کے حال سے واقف نہیں البتہ یہ بات وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ ان روایتوں کی زد راست نبوت جیسی حتمی اور قطعی حیثیت پر پڑتی ہے۔ مثال کے طور پر محمد بن اسحٰق نے

عبید بن عمرو کی زبانی پہلی نزول وحی کے سلسلے میں جو تفصیلات بیان کی ہیں وہ منصبِ رسالت سے قطعی میل نہیں کھاتیں۔ بقول راوی جب آپؐ پہلی وحی کے بعد گھر کی طرف چلے تو راستے میں آسمانی آواز سنی کہ یا محمد انت رسول الله و انا جبرئیل۔ حضورؐ نے اِدھر اُدھر دیکھا جب کچھ نظر نہ آیا تو اوپر نگاہ گئی۔ دیکھا کہ وہ جبرئیل ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ اے محمدؐ آپ اللہ کے رسول ہیں اور میں جبرئیل ہوں۔ حضورؐ نے گھر آ کر جب یہ واقعہ حضرت خدیجہؓ سے بیان کیا تو ان کا فوری ردِّعمل تھا انیّ لارجو ان تکون نبی هذه الامة۔ یعنی مجھے یقین ہے کہ آپؐ اس امت کے نبی ہوں گے۔ اس طرح کی روایتوں سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ گویا نبوت کوئی کسبی منصب ہو جس کے حصول کے لیے میاں بیوی مل کر اپنی کوششیں جاری رکھے ہوئے ہوں۔ ابن اسحٰق نے بعض ایسی روایتوں کو بھی جگہ دی ہے جو بظاہر تو ذاتِ اقدس کے سلسلے میں غلو کے نتیجے میں وجود میں آئی ہیں البتہ ان روایتوں کے سہارے ایک ایسا اساطیری ماحول تشکیل پاتا ہے جس میں نبوت جیسی قطعی شئے محض ایک نفسیاتی اور روحانی تجربہ بن کر رہ جاتی ہے۔ مثال کے طور پر احمد عن یونس کی روایت میں ابن اسحٰق نے لکھا ہے کہ بعثت نبویؐ سے چند سال پہلے ہی جب آپؐ کسی حجر و شجر کے پاس سے گزرتے تو وہ تسلیمات بجالاتے آنحضرتؐ ان کے سلام کو سنتے، اِرد گرد دیکھتے لیکن انہیں درختوں اور پتوں کے علاوہ کچھ اور نظر نہ آتا۔ آپؐ کو صرف السلام علیك یا رسول الله کی صدا سنائی دیتی۔ تو کیا محمدؐ رسول اللہ کو نزول وحی سے پہلے اپنے اس منصب عظیم کے ملنے کا احساس تھا؟ ہمارے خیال میں اگر ایسا ہوتا تو جبرئیل کے اچانک سامنے آجانے سے آپؐ اتنے متوحش نہ ہوتے۔

تاریخ و روایت کے مطالعے کے دوران ہمیں اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے کہ روایت نویسوں نے مختلف مآخذ سے جو مواد ہمارے لئے اکٹھا کیا ہے ان کے مجموعی مطالعے اور تحلیل و تجزیہ کے نتیجہ میں ہم کسی حد تک اس تاریخی پس منظر کو متصوّر کر سکتے ہیں اور بس۔ مگر شرط یہ ہے کہ اس عمل میں قرآن مجید کی روشنی اور غیر تقلیدی ذہن کی رفاقت ہمیں حاصل ہو، ورنہ مختلف قسم کے قصصِ کاذبہ کو سچ جان کر ہم ایک بہت ہی بھونڈی اور مجہول تصویر متشکل کر پائیں گے۔ ذرا غور کیجئے کیا عقل سلیم اس بات کی شہادت دے سکتی ہے کہ محمدؐ رسول اللہ کو، جنہیں مہبطِ وحی کے شرف سے نوازا گیا اور جنہیں نبوت جیسی عظیم ذمہ داری سونپی گئی، انھیں تو اپنی نبوت کے سلسلے میں تذبذب ہو لیکن ورقہ بن نوفل اور خدیجہؓ بنت خویلد انہیں اس بات کا یقین دلائیں کہ اے محمد یقین جانیے خدا نے آپ کو نبوت سے سرفراز کیا ہے اور یہ کہ آپؐ کے پاس جو پیغامبر آتا ہے وہ کوئی اور نہیں وہی ناموس اکبر ہے جو حضرت موسیٰ کی طرف بھیجا جاتا تھا۔ أحمد عن یونس کی ایک دوسری روایت میں تو ابن اسحٰق نے یہاں تک لکھ دیا ہے کہ جبرئیل کی اصل حقیقت کے سلسلے میں آپؐ خاصے متذبذب تھے سو خدیجہؓ نے آپؐ کی دلجمعی کے لئے کہا کہ وہ جب آئیں تو آپؐ مجھے اطلاع دیں۔ پھر اچانک ایک دن جبرئیل تشریف لے آئے۔ آپؐ نے کہا خدیجہؓ یہ جبرئیل میرے پاس آئے ہیں۔ خدیجہؓ نے پوچھا کیا آپؐ انہیں دیکھ رہے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا ہاں! خدیجہؓ نے کہا آپؐ میرے بائیں جانب تشریف لے آئیں۔ آپؐ بائیں جانب آ کر بیٹھ گئے۔ پوچھا: کیا آپؐ اب بھی انہیں دیکھ رہے ہیں فرمایا:

ہاں! خدیجہؓ نے کہا: آپؐ میری دائیں جانب تشریف لے آئیں۔ آپؐ اٹھے اور خدیجہؓ کے دائیں جانب آ کر بیٹھ گئے۔ پوچھا: کیا آپؐ اب بھی انہیں دیکھ رہے ہیں فرمایا: ہاں! کہا آپؐ آ کر میری گود میں بیٹھ جائیں۔ سو رسول اللہ گود میں بیٹھ گئے۔ تب خدیجہؓ نے پوچھا کہ کیا اب بھی انہیں دیکھ رہے ہیں فرمایا: ہاں! راوی کہتا ہے کہ پھر خدیجہؓ نے اپنا چہرہ کھول دیا اور اپنی اوڑھنی اتار دی اور آپؐ بدستور گود میں بیٹھے رہے۔ تب خدیجہؓ نے پوچھا: کیا آپؐ انہیں دیکھ رہے ہیں فرمایا نہیں۔ خدیجہؓ نے کہا: اے ابن عم یہ شیطان نہیں فرشتہ ہے آپؐ کو بشارت ہو (ابن اسحٰق حوالہ مذکور ص ۱۷۳)۔ احمد ہی کی ایک دوسری روایت میں یہاں تک ہے کہ جب حضرت خدیجہؓ نے آنحضرتؐ کو اپنے کرتے کے اندر داخل کر لیا تو جبرئیل واپس چلے گئے، جس سے خدیجہؓ نے استنباط کیا کہ یقیناً یہ فرشتہ ہے شیطان نہیں۔ (ابن اسحٰق حوالہ مذکور ص ۱۷۴)

ہمارے خیال میں اس قسم کے قصۂ کاذبہ پر وہی لوگ یقین کر سکتے ہیں جنہیں منصبِ نبوت کی عظمت کا واقعی احساس نہ ہو۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ ابن اسحٰق، جنہیں ہمارے ہاں پہلے باقاعدہ سیرت نگار کی حیثیت حاصل ہے، نے اس طرح کی خرافات کو اپنے ہاں جگہ دے رکھی ہے اور ورقہ بن نوفل کی تصدیقِ نبوت محمدیؐ کے واقعہ کو تو بخاری و مسلم جیسے اجل محدثین نے کیف بدأ الوحی کے باب میں درج کر رکھا ہے۔

۵۔ بیسویں صدی کے تیسرے دہے میں جب Edwin Hubble نے اس بات کا انکشاف کیا کہ کہکشائیں ایک دوسرے سے مسلسل بڑی سرعت کے ساتھ دوری اختیار کر رہی ہیں تو قرآنی دائرۂ فکر سے ناواقف لوگوں کو اس بات پر سخت حیرت ہوئی۔ حالانکہ کشش ثقل کا بنیادی نکتہ بھی اس خیال پر دال ہے کہ اگر کائنات میں توسیع و ارتقاء کی رفتار سست پڑ جائے تو کشش ثقل کے سبب پوری کائنات سکڑ کر ختم ہو جائے گی۔ البتہ کن فیکون کا یہ عمل ولولہ انگیز برق رفتاری سے جاری رہے تو کشش ثقل کبھی اتنا مضبوط نہ ہوگا کہ توسیع کے اس عمل کو روک سکے۔

۶۔ بلیک ہول یا نقطۂ تاریک دراصل جدید سائنس کا فلسفۂ غیاب ہے۔ وجود سے عدم تک کا یہ سفر دراصل ﴿كل شيء هالك الا وجهه﴾ کی سائنسی تعبیر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کائنات جو مسلسل وسیع ہوتی جاتی ہے بالآخر کشش ثقل کے غیر معمولی اضافہ کے سبب اپنے مرکز میں کچھ اس طرح کھنچے گی کہ آناً فاناً اس کا وجود نقطۂ تاریک میں تحلیل ہو جائے گا۔ اس قسم کے حوادث کا کائنات میں گاہے بہ گاہے ہوتے رہنا عرصے سے اہل علم کے درمیان مسلّمات میں شمار کیا جاتا ہے۔ چونکہ نقطۂ تاریک میں غیاب کا یہ عمل غیر معمولی سرعت کے ساتھ انجام پاتا ہے جو چیز ایک بار اس کے دائرۂ عمل میں پہنچ گئی وہ اس کی گرفت سے نہیں بچ پاتی حتیٰ کہ روشنی بھی جو اپنی سرعتِ رفتار کے لیے مشہور ہے اس کے مرکز میں کچھ اس طرح گرفتار ہوتی ہے کہ ہماری آنکھوں یا کسی آلۂ مشاہدہ کے لیے اس کا دیکھنا ممکن نہیں ہوتا۔

بلیک ہول کے مرکز کو Singularity یعنی وحدیہ کا نام دیا جاتا ہے۔ اس کے اندرونی دائرے کو افقِ داخل (Inner Event Horizon) اور بیرونی دائرہ کو افقِ خارج (Outer Event Horizon) سے موسوم کیا جاتا ہے۔

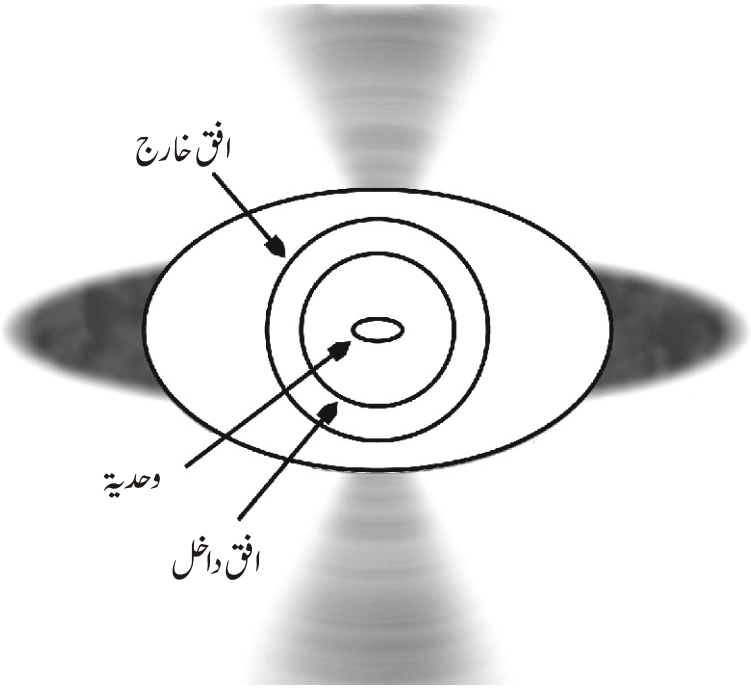

البتہ یہ ایک خیالی تصویر ہے جو افہام و تفہیم کے لیے اہل نظر نے تشکیل دے رکھی ہے ورنہ واقعہ یہ ہے کہ وحدیہ کی ماہیت کے بارے میں ہمیں اب تک کچھ بھی نہیں معلوم۔ بلیک ہول کا یہ عمل کن قوانین کے تابع ہے ابھی ان اسرار و رموز کا اکتشاف باقی ہے۔ ہمیں تو یہ بھی نہیں معلوم کہ نقطۂ تاریک میں غائب ہو جانے والا جسم اس کے اندر جذب ہو کر ختم ہو جاتا ہے یا اس نقطۂ تاریک کے دوسری طرف پائی جانے والی کسی ابدیت کا حصّہ بن جاتا ہے اور یہ کہ دوسری طرف ابدیت ہے یا کچھ اور۔ وحدیہ (singularity) جو نقطۂ تاریک کا اصل الاصل ہے استخزاجی حقیقت کا حصّہ ہوتے ہوئے بھی ہمارے مشاہدہ کا حصّہ نہیں بن سکتا کہ ''عدم'' کو دیکھنا موجودہ ابعاد کی دنیا میں مروجہ علوم کے سہارے ممکن نہیں۔ اب تک نقطۂ تاریک سے متعلق ساری قیاس آرائیاں اس کے اردگرد ظہور ہونے والی سرگرمیوں سے حاصل کردہ ہے۔ مصیبت یہ ہے کہ اگر ہم اپنے مشاہدین کو وہاں تک بھیجنے میں کامیاب بھی ہو جائیں تو دنیائے عدم کے اس تجربے کو ہم تک پہنچانا ان کے لیے ممکن نہ ہوگا۔

اٹھارہویں صدی میں جب پہلی بار اس قسم کی ہلچل کا پتہ لگا تھا تب سے اب تک اہل علم یہ معلوم کرنے سے قاصر رہے ہیں کہ وحدیہ کن قوانین کے تابع ہے۔ محض کشش ثقل اس عمل کی پوری توجیہہ نہیں کرتا۔ اسی خیال سے بعض لوگوں نے اسے quantum gravity کا نام دیا ہے لیکن یہ کام کس طرح کرتا ہے اس کی توجیہہ نہیں کی جا سکی ہے۔ جدید طبیعات کے لیے یہ اب تک ایک عقدۂ لاینحل ہے۔ توقع ہے جوں جوں کائنات کے سلسلے میں ہمارا علم

آگے بڑھتا جائے گا عدم اور ابدیت جیسے مسائل کو کسی قدر سمجھنا ممکن ہو سکے گا۔

۷۔ عام طور پر مفسرین کو اس آیت کے سلسلے میں یہ اشتباہ ہوا ہے کہ شاید پہاڑوں کا بادلوں کی طرح تیرنا ایک ایسی دنیا کا بیان ہے جسے ہم یوم آخرت سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس التباس کی ایک وجہ شاید یہ ہے کہ اس آیت سے پہلے ﴿یوم ینفخ فی الصور﴾ کے ذکر سے مفسرین کا ذہن عالم آخرت کی طرف منتقل ہو گیا ہے۔ ہمارے خیال میں ایسا سمجھنا کئی وجوہ سے صحیح نہیں ہے۔ اولاً وتر الجبال حال کا بیان ہے مستقبل کا نہیں۔ ثانیاً جو لوگ قرآن کے اسلوب و بیان سے واقف ہیں وہ بآسانی اس نکتہ کو سمجھ سکتے ہیں کہ قرآن مختلف تناظر کو یکے بعد دیگرے سامنے لا کر اس حقیقت کی تلقین کرنا چاہتا ہے کہ ﴿من جاء بالحسنیٰ فله خیر﴾ اور یہ کہ ﴿من جاء بالسیئة فکبت وجوهھم فی النار﴾ (النمل: ۹۰-۸۹)۔ اس خیال کی تذکیر کے لیے دلائل اور تناظر کا مختلف سلسلہ اس سے پچھلی آیتوں میں جاری ہے۔ طوالت سے بچتے ہوئے ہم صرف ملحقہ تین آیتوں کا تذکرہ کریں گے۔ ﴿الم یروا انا جعلنا اللیل لیسکنوا فیه والنهار مبصرا... الخ﴾ یعنی کیا تم لیل و نہار کی گردش اور اس کی افادیت پر غور نہیں کرتے اور یہ کہ کیا تم اس دن کو برحق نہیں سمجھتے جب صور پھونکا جائے گا تو ہر شئے پر ہیبت طاری ہو جائے گی اور پھر ہر کوئی اس کے حضور انتہائی عاجزی کے ساتھ حاضر ہو جائے گا۔ اور یہ جو تمہارا خیال ہے کہ یہ پہاڑ اپنی جگہ پر جامد ہیں تو حقیقت یہ ہے کہ یہ بادل کی طرح تیر رہے ہیں، انھیں اللہ نے کمالِ حکمت سے بنایا ہے جو ہر شئے کو کمالِ فن سے تخلیق کرتا ہے۔ وہی ہے جو تمہارے تمام عمل سے خوب خوب واقف ہے سو اس حقیقت کو ذہن نشین کر لو کہ جو کوئی نیک عمل کرے گا تو وہ اپنے لیے بہتری پائے گا اور جو لوگ برائی کریں گے وہ اوندھے منھ آگ میں ڈالے جائیں گے۔ ان تذکیری تناظرات سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ جو چیز بظاہر ہمیں حیرت انگیز معلوم ہو وہ امر واقعہ کے خلاف ہو گی کہ پہاڑوں کا مثل سحاب تیرنا اگر مستقبل کی دنیا کا بیان ہوتا تو پھر یہ بات کہنے کی ضرورت ہی کیا تھی ''کہ تم جن پہاڑوں کو دیکھتے ہو اور سمجھتے ہو کہ وہ جمے ہیں وہ اس دن بادلوں کی طرح اڑ رہے ہوں گے۔'' اگر اس مفہوم کو درست قرار دیا جائے تو کسی نئی حقیقت کی عقدہ کشائی نہیں ہوتی البتہ اگر اسے حال کے بیان کے طور پر دیکھا جائے تو یہ پتہ لگتا ہے کہ جن پہاڑوں کو ہمارا مشاہدہ منجمد و ساکت سمجھتا ہے فی الواقع ایسا ہے نہیں کہ یہ مثل سحاب گردش میں ہیں۔

۸۔ اشارہ ہے اس آیت کی طرف ﴿زیّن السماء الدنیا بزینة الکواکب﴾ (۳۷:۶)

۹۔ اشارہ ہے اس آیت کی طرف ﴿ان فی اختلاف الیل والنهار وما خلق الله فی السمٰوٰت والارض لآیات لقوم یتقون﴾ (۱۰:۶)

۱۰۔ روایتی قرآن فہمی کا اندازہ کچھ اس لطیفے سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ جب سعودی عرب کے شہزادہ سلطان بن سلمان خلائی مشن پر جانے والے پہلے سعودی نوجوان کی حیثیت سے خبروں کا موضوع بنے تو بعض علماء نے بلا تکلف اس

واقعہ کو قرآن کی پیش گوئی پر محمول کیا۔ اور دلیل میں آیت لاینفذون الا بسلطان سے استدلال کیا۔ حالانکہ قرآنی سیاق میں نہ تو سلطان سے کوئی شخص خاص مراد ہے اور نہ ہی وہ فضا میں جانے والے پہلے شخص تھے۔

۱۱۔ قرآن سے نابلد غیر سائنسی ذہن عرصہ ہائے دراز تک کائنات کی پراسرار ہیبت ناکی کے سلسلے میں مختلف اندیشوں کا شکار رہا ہے۔ بیسویں صدی کے وسط سے جب انسانی مشاہدے کو جدید کیمروں کی سہولت حاصل ہوئی تب ہی سے UFO کے سلسلے میں حیرت انگیز داستانیں ہمارے مشاہدے کا حصہ بنتی رہی ہیں۔ عرصہ تک ان مشاہدات کے سلسلے میں انسانی ذہن ایک طرح کی ماورائیت کا شکار رہا بلکہ اب بھی اس سلسلے میں قطعیت کے ساتھ بہت سی باتیں نہیں کہی جاسکتیں۔ البتہ UFO پروجیکٹ کے نتیجے میں اور بالخصوص کارل ساگن کی تحریروں سے اب یہ خیال خاصا عام ہو گیا ہے کہ اربوں کہکشاؤں کی اس وسیع کائنات میں کم از کم ایک ارب کہکشائیں تو ایسی یقیناً ہوسکتی ہیں جہاں زندگی اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہو۔ گو کہ ابھی اس خیال کی حیثیت ایک عالمانہ قیاس سے زیادہ نہیں البتہ ساگن اور ان کے بعض احباب اس امید پر دنیا سے رخصت ہو گئے کہ مختلف کرہ ہائے ارضی اور مختلف کہکشاؤں میں آباد ذی روح جو الکٹرومیگنٹک پیغام ہمیں بھیج رہے ہیں بہت جلد ہم اہلِ زمین ان پیغامات کو سننے اور سمجھنے کے اہل ہوسکیں گے۔ گویا جوں جوں کائنات کے سلسلے میں انسانی علم بڑھتا جاتا ہے مختلف کہکشاؤں میں پائی جانے والی مخلوق، دابہ کے اجتماع کا خدائی وعدہ، ایسا محسوس ہوتا ہے اپنی منطقی منزل کی طرف پیش قدمی کر رہا ہو۔ ہمیں نہیں معلوم کہ ذی نفسوں کا یہ اجتماع دنیائے آخرت میں پیش آئے گا یا انسان کی اکتشافی صلاحیتیں خود اس زمان و مکاں کی دنیا میں اس کارنامے کو انجام دینے پر قادر ہوسکیں گی۔ البتہ ہم یہ بات وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ وحیِ ربانی نے ان تفصیلات کے ذریعے اس بات کا پورا التزام کیا کہ اردگرد کی دنیا میں پراسرار سرگرمیوں سے خوف کھانے یا ان کے آگے سجدہ ریز ہو جانے کے بجائے ہم ان اشارات کی روشنی میں اپنے عقل و فہم کی کمان پر اپنی گرفت مضبوط بنائے رکھیں۔ یہی ہے وہ اکتشافی اور تسخیری ذہن جس نے پہلی نسل کے مسلمانوں کو اس حد تک اعتماد سے سرفراز کر دیا تھا کہ وہ خدا کی سرزمین پر کلمۃ اللہ ھی العلیا کو اپنا فریضۂ منصبی جانتے تھے۔ اس اعتماد نے انھیں سو سال سے بھی کم عرصے میں اس سرزمین کا وارث بنا دیا تھا۔

۱۲۔ ہمارے خیال میں اسماء الحسنیٰ کو محض صفاتی انداز سے دیکھنے کے بجائے انھیں ابعاد کا بیان سمجھنا چاہیے جس میں خدا جلوہ گر ہے۔ وہ حق ہے، غفور الودود ہے، رب العرش الکریم ہے، لاالہ الا ھو ۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ خدا کو ان ابعاد و صفات میں بھی مقصور کرنا یا حیطۂ ادراک میں لانا امر محال ہے۔ اس کے لیے لازم ہے کہ انسان ابعاد اربعہ کے بصائر سے آگے دیکھنے کا حوصلہ رکھتا ہو۔ یوم آخر میں مومنین کے لیے دیدار ربی کا مژدہ اسی خیال کی غمازی کرتا ہے کہ زمان و مکاں سے ماورا ابدیت میں ان ابعاد کی تفہیم کسی قدر آسان ہو جائے گی جس سے لقائے ربی کا مژدۂ جانفزا عبارت ہے۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو جنّت اور جہنّم ابعاد کی مختلف جہتیں ہیں۔ ﴿فادخلی یا عبادی وادخلی جنتی﴾ اس صورت حال کا بیان ہے جب مومنین کے لیے لامکاں کی ابعاد میں داخلہ ممکن ہو سکے گا۔ گویا

مختصراً یہ کہہ لیجئے کہ یہ کائنات ابعاد کی مختلف سطحوں اور جہتوں کا ایک پیچیدہ نظام ہے۔ یہاں اگر ایک طرف ابعاد اربعہ کے انسانوں کو بسا اوقات ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حقیقت ان کو چھو کر گزر گئی ہے اور ان کا حیطۂ ادراک ایک متجسس تشنگی کا شکار رہ گیا ہے تو وہیں یہ احساس بھی عام ہے کہ راہ طلبوں کے لیے بھٹکنے یا ضائع ہو جانے کا امکان خاصا کم ہے۔ اگر دل کی گہرائیوں سے اھدنا الصراط المستقیم کی بازگشت مسلسل آتی رہے تو کوئی وجہ نہیں کہ وحی ربانی کی تجلیاں اس کی رہنمائی نہ کریں کہ ﴿اللہ ولی الذین آمنوا یخرجھم من الظلمات الی النور﴾ (بقرہ ۲۵۷)۔ روشنی اور تاریکی بھی ابعاد کی مختلف جہتیں ہیں۔ انسان کے لیے ممکن ہے کہ وہ ظلمت اور نور میں سے جس ابعاد میں بھی رہنا چاہے اس کا انتخاب کر لے۔

۱۳۔ انفس و آفاق کے سلسلے میں انسانی علم جوں جوں آگے بڑھتا جاتا ہے خدائے ذوالجلال کی ہیبت و جلالت سے ہمارے دل و دماغ مبہوت ہوتے جاتے ہیں۔ فی زمانہ DNA کی نئی تحقیقات نے احسن تقویم کی ایک نئی دنیا ہم پر وا کر دی ہے حتیٰ کہ وہ لوگ بھی جو اب تک خدا کے وجود کے سلسلے میں شکوک و شبہات میں مبتلا تھے ان کے لیے اس منظم، مربوط اور منصوبہ بند انفس و آفاق کا انکار مشکل ہو گیا ہے۔

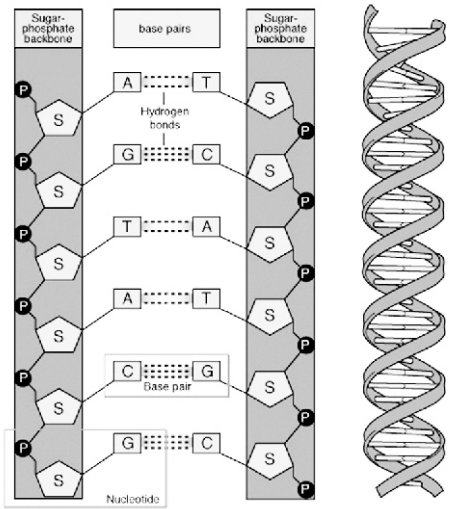

ذرا غور کیجئے تخلیق کی اس صنّاعی پر انسانی جسم کا ہر خلیہ ایک ہی شناخت یا DNA کا حامل ہے۔ DNA جسے اہل سائنس Deoxyribonucleic acid کے مخفف کے طور پر جانتے ہیں، دراصل چار کیمیائی امور سے بنا ہوتا ہے۔ (A) adenine، (G) guanine، (C) cytosine اور (T) thymine انسانی DNA کوئی تین بلین امور پر مشتمل ہوتا ہے جن میں سے ننانوے فیصد امور ہر انسان میں تقریباً یکساں ہوتے ہیں۔ یہ چار بنیادی امور دو دو جوڑوں کی شکل میں رہتے ہیں اس طرح کہ T,A کے ساتھ اور G,C کے ساتھ مربوط ہوتا ہے۔ یہ جوڑے شکر اور

فاسفیٹ مادوں کے ساتھ مل کر Nucleotide بناتے ہیں اور پھر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک لامتناہی سیڑھی کی شکل میں یہ سب آپس میں مربوط ہو گئے ہوں۔ کہا جاتا ہے کہ T,A اور G,C کا یہ مربوط سلسلہ ایک ایسا سرّی کوڈ ہے جو ہر انسان کی ایک الگ کہانی سناتا ہے۔ ماضی، حال اور مستقبل کے نہ جانے کتنی ان کہی اور گمشدہ داستانیں ان کوڈز کے افشا سے معلوم کی جا سکتی ہیں گویا انسانی خلیہ کے اندر DNA کا علیحدہ علیحدہ پروگرام اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ انسان ایک پروگرام لے کر دنیا میں آیا ہے جو اپنے طئے شدہ راستے پر آگے بڑھ رہا ہے۔ ایک خلیہ سے برآمد ہونے والی معلومات کو اگر پرنٹ کیا جائے تو اس کے لیے کوئی پچاس ہزار صفحات درکار ہوں گے۔ حیرت اس بات پر ہے کہ ہر شخص کا DNA الگ ہے جس سے اس کے خاندانی کوائف کا پتہ لگایا جا سکتا ہے اور اس بات کا بھی پتہ چل سکتا ہے کہ ماضی میں نسلا بعد نسل اس کا سفر کس طرح جاری رہا ہے اور یہ کہ آنے والے دنوں میں اس کے موروثی رجحانات کے سبب اس سے کیا توقع کی جانی چاہیے۔ ایک چھوٹے سے باریک بین انسانی خلیہ میں حال و مستقبل کا یہ منصوبہ بند پروگرام اس بات کی شہادت کے لیے کافی ہے کہ زندگی کا یہ تماشا خود بخود وجود میں نہیں آ گیا ہے۔

حالیہ برسوں میں DNA کی ان تحقیقات نے ڈارون پرستوں کے غبارے سے ہوا نکال دی ہے جو اب تک یہ دعویٰ کرتے رہے ہیں کہ انسانی زندگی اختیارِ فطرت (Natural Selection) کے نتیجہ میں از خود وجود میں آ گئی ہے۔ بیسویں صدی میں فلسفۂ الحاد کے سب سے بڑے امام اینٹونی فلیو، جن کی کتاب *God and Philosophy* الحاد کے منشور کے طور پر پڑھی جاتی رہی ہے، انھوں نے سال ۲۰۰۴ء میں اپنے تقلیبِ فکر و نظر کا اعلان کر دیا۔ فلیو کا کہنا تھا کہ DNA کی تحقیقات کے بعد اب کسی کے لیے یہ سوچنا بھی ممکن نہیں رہا کہ زندگی کا وجود ارتقاء کے اصول اختیارِ فطرت کے نتیجے میں ظہور پذیر ہوا ہے۔ جب سے انھوں نے DNA کی جدید تحقیقات پر غور و خوض کرنا شروع کیا ہے انھیں اس بات کا احساس شدید تر ہوتا جاتا ہے کہ کوئی ہستی اس کائنات کی خالق ہے جس کی صناعی کائنات کے اندرون میں پیوست ہے۔ نہ صرف یہ کہ کائنات سے ماوراء بھی بہت کچھ ہے بلکہ اب تک ہمیں جو کچھ معلوم ہو سکا ہے اسے حرفِ آخر قرار نہیں دیا جا سکتا ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

Antony Flew, 'Letter From Antony Flew on Darwinism and Theology', *Philosophy Now,* (Issue 47, August/September 2004, p.22

@ www.philosophynow.org/issue47/47flew.htm

Craig J. Hazen, Gary R. Habermas & Antony Flew, 'My Pilgrimage from athiesm to Theism: An Exclusive Interview with Former British Atheist Professor Antony Flew.'

@ www.biola.edu/antonyflew/flew-interview.pdf

۱۴۔ آثار و روایت کی کتابوں میں جنوں کی زندگی، ان کی سماجی تنظیم و ترتیب، شادی بیاہ کے معاملے حتیٰ کہ انسانوں سے ان کی شادی کے قصے بھی رنگا رنگ انداز سے پیش کیے گئے ہیں۔ گو کہ احادیث کی کتابوں میں اس قبیل کی روایتوں کے بارے میں محدثین کی یہ آراء بھی موجود ہیں کہ فلاں روایت منقطع ہے اور فلاں مرسل اور فلاں کی حیثیت محض

اسناد جید کی ہے۔مگر مستند کتابوں میں ان روایتوں کا درآنا ہی اس بات کے لیے کافی ہے کہ وہ متجسس ذہن کے لیے مسلسل غذا فراہم کرتی رہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلا التباس تو یہ ہے، جیسا کہ ابن تیمیہ نے لکھا ہے، کہ شیطان کی حیثیت جنوں کے باوا آدم کی ہے۔ (مجموع الفتاویٰ، ۲۳۵/۴، ص ۳۴۶) اس لیے علماء کا ایک قابل ذکر طبقہ شیطان کے سلسلے میں تمام تفصیلات کا اطلاق جنوں پر بھی کرتا ہے۔ حالانکہ ان ہی روایتوں میں جنوں کے مسلم اور غیر مسلم ہونے کا تذکرہ بھی موجود ہے۔ اور جولوگ قرین (دیکھئے روایت حضرت عائشہ، صحیح مسلم ۲۱۶۸/۴ نمبر ۲۸۱۵) کے تصور پر یقین رکھتے ہیں وہ اس بات کے بھی قائل ہیں کہ رسول اللہ پر جو قرین یا جن متعین تھا، جیسا کہ اس تصور کے مطابق ہر انسان پر ایک جن متعین ہوا کرتا ہے، وہ اسلام لا چکا تھا۔ (اگر روایت کے الفاظ فاتکم پڑھیں، شرح النوی علی مسلم ۱۵۸/۱۷)

بعض مفسرین نے اس خیال کی تائید میں خاصا زور صرف کیا ہے کہ رسول اللہ انسانوں کے علاوہ جنوں کی طرف بھی نبی بنا کر بھیجے گئے تھے۔ ہوسکتا ہے اس قسم کے دعاوی سے انھیں محمد رسول اللہ کی عظمت باور کرانا مقصود ہو۔ بعض روایتوں میں اس رات کا تذکرہ بھی موجود ہے جب مکہ میں رسول اللہ کی تلاش میں صحابہ کرام پریشان پھرا کئے، انھیں رسول اللہ کے غیاب کے سلسلہ میں سخت تشویش لاحق ہوگئی۔ حالانکہ قرآن مجید میں سورہ جن کی ابتدائی آیات کا خطاب اس بات پر دال ہے کہ جنوں کے قرآن سننے کا واقعہ از روئے اتفاق تھا۔ آپؐ بالارادہ ان کی طرف تبلیغ کے لیے نہیں گئے تھے۔ سورہ انعام کی آیات میں بھی بصراحت اس خیال کا اعادہ کیا گیا ہے کہ جنوں اور انسانوں کے درمیان انبیاء ان کے اندر سے ہی مبعوث ہوتے ہیں: ﴿یا معشر الجن والانس الم یاتکم رسل منکم﴾ ۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ اس صراحت کے باوجود ہم رسولؐ اللہ کی واضح اور مبین شخصیت کے گرد اساطیری قصے کہانیوں کی طنابیں کھینچنے کی کوشش کریں۔

بعثت کے بعد رسولؐ اللہ کی زندگی کا ایک ایک لمحہ روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔ یہ ایک ایسی کھلی کتاب ہے جس میں کسی ابہام اور التباس کو کوئی دخل نہیں۔ اس کے برعکس اگر ان روایتوں پر یقین کیا جائے جو مسلم کی روایت کے مطابق بقول ابن مسعود یہ بتاتی ہیں کہ ایک رات رسولؐ اللہ اچانک غائب ہو گئے ہم لوگوں نے انھیں غائب پا کر وادیوں اور پہاڑوں پر ہر جگہ تلاش کیا۔ سخت تشویش ہوئی کہ یا تو وہ لے جائے گئے یا قتل کر دیئے گئے۔ ہم لوگوں پر یہ رات بہت سخت گزری تب صبح میں ہم نے دیکھا کہ آپؐ حرا کی جانب سے تشریف لا رہے ہیں۔ ہم نے پوچھا یا رسولؐ اللہ آپ گم ہو گئے تھے، ہم آپؐ کو تلاش کرتے رہے اور آپؐ کو نہ پا سکے۔ ہمارے لیے یہ رات اتنی سخت تھی کہ شاید ہی کوئی ایسی رات کبھی ہمارے حصّے میں آئی ہو۔ تب آپؐ نے انھیں بتایا کہ کس طرح جنوں کی دعوت پر آپ قرآن سنانے کے لیے وہاں گئے تھے۔ سیوطی نے اپنی کتاب الدرالمنثور للتفسیر بالماثور (۶۹۰/۷) میں ترمذی ابن منذر اور بیہقی کے حوالے سے جابر بن عبداللہ سے روایت کیا ہے کہ اس شب آپؐ نے جنوں کی مجلس میں سورہ رحمٰن کی تلاوت کی تھی۔ جب آپ فبای آلاء ربکما تکذبان کی تلاوت کرتے تو جنوں

کے مجمع سے آواز آتی ہے کہ ہم ہرگز نہیں جھٹلاتے تیرے انعامات کو۔ سیوطی (۷/۶۹۰)

اس قبیل کی روایتوں سے، جو رسولؐ اللہ کو بیک وقت انسانوں اور جنوں کے مابین دو مختلف سطحوں پر پیغام رسائی پر مامور بتاتی ہیں، رسول اللہ کی عظمت میں اضافہ ہوتا ہو یا نہیں، ہاں ان الزامات کو تقویت ضرور فراہم ہوتا ہے کہ آپؐ پر دشمنوں نے رجل مسحور کا جو الزام عائد کیا تھا اور آپؐ کے آسمانی رابطوں کے سلسلے میں جو شبہات وارد کیے تھے ان کی بنیاد ان واقعات میں پائی جاتی ہے۔ ہمارے خیال میں جن جیسی غیر مرئی مخلوق کا ذکر اور اس سلسلے میں بعض قرآنی اشاروں سے صرف اتنا مقصود ہے کہ کائنات کی سرّیت مومنین کے ذہنوں پر واضح رہے البتہ یہ کسی اساطیری ذہن کی تعمیر کے لیے جواز فراہم نہ کرے۔

قرآنی بیان سے باہر روایتوں میں جو کچھ موجود ہے اس سے نہ صرف یہ کہ اکتشافی ذہن کے بجائے ایک اساطیری دائرۂ فکر تشکیل پاتا ہے بلکہ ان روایات کی زد راست رسول اللہ کی پیغمبرانہ حیثیت پر پڑتی ہے۔ مثال کے طور پر بخاری میں موجود ابو ہریرہؓ سے مروی اس واقعہ کو لیجیے۔ ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ نے انھیں زکوۃ رمضان کا محافظ مقرر کیا تھا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ رات میں ایک شخص اشیاء خورونوش چرا رہا ہے آپ نے جب اسے پکڑا اور یہ دھمکی دی کہ میں تمھیں رسول اللہ کے سامنے پیش کروں گا تو کہنے لگا کہ میں سخت محتاج ہوں اور میرے بچے ہیں، سو میں نے اسے چھوڑ دیا۔ صبح رسول اللہ نے مجھ سے پوچھا کہ اے ابو ہریرہ تمہارے قیدی کا کیا ہوا۔ میں نے سارا واقعہ بتایا آپؐ نے کہا وہ جھوٹا ہے پھر واپس آئے گا۔ تین راتوں تک مسلسل ایسا ہوتا رہا یہاں تک کہ میں نے اسے پکڑنے کا عزم مصمم کرلیا۔ کہنے لگا کہ اگر تم مجھے جانے دو تو میں تمہیں ایک ایسی بات سکھاؤں گا جس سے خدا تمہیں بہت فائدہ دے گا۔ میں نے پوچھا وہ کیا کہنے لگا کہ جب تم بستر پر جاؤ تو سونے سے پہلے آیت الکرسی پڑھ لو تم اللہ کی محافظت میں ہو گے اور صبح تک تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔ صبح جب میں نے یہ بات رسول اللہ کو بتائی تو رسول اللہ نے کہا کہ اس نے تجھ سے سچ کہا گو کہ وہ جھوٹا ہے۔ رسول اللہ نے پوچھا اے ابو ہریرہ کیا تم جانتے ہو کہ پچھلی تین راتوں سے تمہیں جس شخص سے سابقہ پیش آتا رہا تھا وہ کون تھا؟ کہا نہیں! آپؐ نے فرمایا، وہ دراصل ایک شیطان تھا۔ محدثین کہتے ہیں کہ یہ حدیث منقطع ہے کہ عثمان بن حشم نے وضاحت سے یہ بات نہیں بتائی کہ انھوں نے اسے راست اپنے شیخ سے سنا تھا لیکن حدیث کی فنی حیثیت سے قطع نظر آیت الکرسی کی فضیلت کے سلسلہ میں جو تعلیم ہمیں شیطان کی وساطت سے پہنچی ہے اس پر آج بھی ایک زمانہ عامل ہے۔ پھر یہ بات بھی سمجھ میں نہیں آتی کہ قرآنی آیات کے جن تاثیری رموز سے یہ شیطان واقف تھا وہ اگر ابو ہریرہؓ سے اس راز کو افشا نہ کرتا تو کیا یہ بات آج ہمارے علم کا حصہ ہوتی؟ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ رسول اللہ نے راست ان فضائل کا تذکرہ صحابہ کرام سے کیوں نہ کیا۔ اس قبیل کی روایتوں کو صحیح مان لینے سے اس کے بڑے دوررس اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

یہ ان ہی روایتوں کا اثر ہے کہ آج امت میں مختلف قسم کے توہمات کو مذہبی استناد حاصل ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ سیاہ کتے اور بلیاں دراصل جنوں کے محبوب قالب ہیں۔ تو کوئی کہتا ہے کہ گھروں میں پائے جانے والے سانپ

جن ہو سکتے ہیں جن کو مارنے سے احتراز کرنا چاہیے۔ مسلم میں ابوسعید خدری کی ایک روایت میں اس خیال کا اظہار کیا گیا ہے کہ مدینہ میں بعض جن ایسے تھے جو مسلمان ہو گئے تھے سوان کے بارے میں آپؐ نے فرمایا تھا کہ انھیں مارنے سے پہلے تین دن کی مہلت دو اور پھر بھی وہ نہ جائے تو اسے مار دو کہ وہ شیطان ہے۔ (مسلم ۴/ ۱۷۵۶ نمبر ۲۲۳۶) علماء سلف کے درمیان یہ بات بھی موضوع بحث رہی ہے کہ جنوں اور انسانوں کے مابین شادیاں جائز ہیں یا نہیں۔ ابن تیمیہ کہتے ہیں کہ ایسا نہ صرف یہ کہ جائز ہے بلکہ بسا اوقات ایسا ہوتا بھی ہے۔ (مجموع الفتاویٰ ۱۹/ ۳۹) جبکہ حسن اور قتادہ ایسی شادیوں کو مکروہ بتاتے ہیں۔ امام مالک جن وانس کے مابین شادیوں کو ناجائز تو نہیں بتاتے کہ اسے روکنے کے لیے ان کے پاس کوئی دلیل شرعی نہیں البتہ وہ اس صورت حال سے خوف کھاتے ہیں کہ کوئی حاملہ عورت جب یہ بتائے گی کہ اس کا یہ حمل اس کے جن شوہر سے ہے تو یہ بات معاشرے میں فتنہ کو جنم دے گی (احکام المرجان، ص ۶۷)۔ عبداللہ بن مسعود کی ایک روایت میں یہ بتایا گیا ہے کہ رسول اللہ سے جنوں کے جس گروہ نے قرآن مجید سنا تھا وہ مختلف قالب میں تھے کوئی گدھ تھا تو کوئی سانپ اور بعضوں نے طویل القامت سیاہ انسانی شکلوں میں سفید جبہ ملبوس کر رکھا تھا۔ راسخ العقیدہ مسلمانوں میں یہ خیال بھی عام ہے کہ شریر جن انسانوں پر سوار ہو جاتے یا ان میں حلول کر جاتے ہیں جنھیں اتارنے کے لیے علمائے دین اور حاملین شرع متین کی مدد لی جا سکتی ہے۔ بلکہ عامۃ المسلمین میں تو یہ خیال بھی راسخ ہے کہ قرآن مجید کی آخری دو سورتیں معوذتین دراصل جنوں کے اثرات بد سے بچنے کے لیے ہی نازل کی گئی ہیں۔ اس بارے میں ہم پہلی جلد میں کسی قدر تفصیل سے ذکر کر چکے ہیں (دیکھیے ادراک زوال امت، ج ۱، ص ۱۶۲–۱۶۴) یہاں صرف یہ بات ذہن نشیں کرنا مقصود ہے کہ جنوں کے سلسلے میں آثار و تاریخ کے دفتر میں جو رنگا رنگ حکایتیں پائی جاتی ہیں اس نے مسلم ذہن کو اساطیری اور خوابیدہ ماحول کا عادی بنا دیا ہے۔

قرآن مجید نے غیر مرئی مخلوق کا تذکرہ اس لیے کیا تھا کہ انسان قوانین فطرت میں موجود ان امکانات سے آگاہ ہو، اساطیری ذہن نے اسے بزرگوں کی کرامت قرار دے ڈالا۔ یہ خیال عام ہوا کہ قصہ سلیمان میں تخت سبا کا آن واحد میں آموجود ہونا جس علم کے سبب تھا وہ علم الکتاب یعنی قوانین فطرت نہیں بلکہ کلمہ سرّ کے سبب تھا۔ امام باقر سے ایک روایت منقول ہے کہ اسم اعظم تہتّر حرفوں یا اجزاء پر مشتمل ہے۔ آصف بن برخیا جو آن واحد میں تخت بلقیس لے آیا تھا اور جو چشم زدن میں زمین کے طول و عرض کی مسافت طئے کر سکتا تھا اسم اعظم کے صرف ایک حرف سے واقف تھا جبکہ ہم شیعہ اماموں کو بہتّر حرفوں کا علم دیا گیا ہے۔ البتہ آخری حرف کا علم تمام مخلوقات سے پوشیدہ ہے اور صرف خدا اس راز سے واقف ہے۔ خضر کی صحرا نوردی اور آن واحد میں ان کا لوگوں کی مدد کو پہنچ جانا ثقہ مسلمانوں کے نزدیک کوئی اجنبی خیال نہیں ہے۔ بایزید بستامی کا رات کو مکہ جانا اور صبح واپس آ جانا یا پانی پر ان کے چلنے کی کرامت اور اس قسم کے دیگر بے شمار واقعات، جو مختلف پیروں فقیروں سے منسوب ہیں، اس خیال کی جوت جگاتے ہیں کہ ان تمام محیر العقول کارناموں کی انجام دہی ایک کلمۂ سرّ یا اسم اعظم سے آگہی پر منحصر ہے۔ اسم اعظم

کی تلاش اور اس سے واقفیت کے دعاوی سے بھی ہمارے متصوفانہ ادب میں مسلسل ہلچل کی کیفیت رہی ہے۔ البتہ کسی کو یہ خیال نہ آیا کہ چشم زدن میں طول وعرض کا سفر یا طئے الارض، یعنی کسی شخص کے لیے زمین کے لپیٹ دیئے جانے کا عمل، کوئی ایسا ناممکن خیال نہیں جس کی تلاش میں پیروں فقیروں کی طلسماتی ملفوظات کی ورق گردانی کرنی پڑے۔ بلکہ یہ عملی دنیا میں عین ممکن ہے۔ شرط یہ ہے کہ سلیمان کے اس جن کی طرح ہم بھی علم الکتاب سے متصف ہوں، یعنی ان قوانین فطرت تک ہماری فنکارانہ رسائی ہو سکے تو آج بھی ٹیلی پورٹیشن کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوسکتا ہے۔

۱۵۔ String Theory کائنات میں ایک ایسے بنیادی کلیہ کی دریافت سے عبارت ہے جسے راس الکلیہ قرار دیا جا سکے نظری طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ اس قسم کے کسی کلیہ کا سراغ پا جانے سے ہمارے لیے ابعادِ ثلاثہ یا اربعہ سے آگے کوئی گیارہ یا بارہ ابعاد کی تفہیم ممکن ہو سکے گی۔ اب تک ہم خانوں میں سوچتے آئے ہیں۔ کبھی ہم اہل یونان کی طرح کائنات کو آگ، پانی، خاک اور ہوا کے چار عناصر میں منقسم سمجھتے تھے جب یہ علم کچھ آگے بڑھا تو سو سے کچھ اوپر عناصر کی تخصیص کی گئی۔ پھر بات جب کچھ اور آگے بڑھی تو کائنات میں چار قوتوں کی کارفرمائی بتائی گئی۔ برقی و مقناطیسی قوت (Electro Magnatic Force) ثانیاً قوت کشش (Gravitational Force) ثالثاً ایٹم کے اندر پائے جانے والے نیوکلیئر فورس کے دو اقسام جنھیں کمزور اور مضبوط قوتوں کا نام دیا گیا ہے۔ نیوکلیئر فورس اگر کمزور ہو تو radioactive زوال کا شکار ہو جاتا ہے اور اگر مضبوط ہو تو نیوٹرون کے ساتھ مل کر nucleus بنائے رکھنے میں مدد دیتا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ تمام کلیے کائنات کی کوئی مربوط توجیہہ کرنے سے عاجز ہیں۔ کیا یہ چار قوتیں جن کا ابھی ہم نے بیان کیا اپنا الگ الگ وجود رکھتی ہیں یا ایک ہی شئے کا مختلف سطحوں پر اظہار ہیں۔ کبھی ہم برقی اور مقناطیسی قوت کو الگ الگ شمار کرتے تھے اب ہم اسے برق و مقناطیسی قوت (Electro Magnatic) کا ہی قالب بتاتے ہیں۔

علمائے سائنس عرصہ سے اس بات کی تلاش میں ہیں کہ کائنات کی توجیہہ اور تفہیم کے لیے وہ راس الکلیہ ہاتھ آجائے جسے اب تک کے دریافت شدہ مسلّمات میں ام الکلیہ کی حیثیت حاصل ہو۔ String Theory اسی طرف ایک قدم ہے۔ آئن اسٹائن ایک ایسے ہی راس الکلیہ کی دریافت کا خواب لیے دنیا سے چلے گئے۔ آج بھی تیس سال کی تحقیق کے بعد ہم اس راس الاسرار سے پردہ اٹھانے میں کامیاب نہیں ہو سکے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ جو لوگ String Theory کے اس غلغلہ آمیز ہنگامے میں اس کی مخالفت اور دوٹوک استرداد سے اپنا دامن بچاتے رہے ہیں تو اس کا سبب یہ ہے کہ کہیں بادشاہ کے ننگے ہونے کا اعلان ان کی حماقت کا ثبوت نہ بن جائے۔ اس بارے میں تازہ ترین مباحث کے لیے ملاحظہ کیجئے۔ Peter Woit, *Not Even Wrong* Lee Smolin, *The Trouble With Physics*.

۱۶۔ قرآنی انداز بیان اس بات پر دال ہے کہ یہ بات رسولؐ اللہ کے علم میں نہیں تھی کہ جب آپ قرآن پڑھ رہے تھے تو

جن اسے سن رہے تھے البتہ بعد میں ان آیات کے ذریعہ آپؐ کو اس واقعہ کا علم ہوا۔ مسلم، ترمذی اور مسند احمد وغیرہ میں بھی عبداللہ بن عباس سے بصراحت موجود ہے کہ رسولؐ اللہ نے جنوں کے سامنے قرآن مجید نہیں پڑھا تھا اور نہ انھیں دیکھا تھا۔

۱۷۔ اب تک شعور کی سرّیت سے پردہ اٹھانے کی تمام کوششیں نئی الجھنوں کا سبب بنی ہیں۔ خاص طور پر نیوروسائنس نے مسئلہ کو جس میکانیکی طریقے سے دیکھنے کی کوشش کی ہے اس سے اس عقدہ کی گرہ کشائی نہیں ہوتی کہ شعور یا روح پائی کہاں جاتی ہے۔ برین میپنگ کا عمل جس سے ہم یہ پتہ چلاتے ہیں کہ خوشی، غصّہ یا تفکر کے نتیجے میں دماغ کی رگوں میں خون کی گردش کیا تاثر قائم کرتی ہے تو اس کی حیثیت ردّعمل یا Symptoms کی ہے اس سے یہ کہاں پتہ چلتا ہے کہ شعور فی نفسہٖ کہاں ہے اور اس کی ماہیت کیا ہے؟ نیوروسائنس نے جب سے شعور کو کیمیائی مادوں اور نیورون کے تعامل کی سطح پر سمجھنے کی کوشش کی ہے، بظاہر تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہم پر حقیقت عیاں ہوگئی ہو لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس بنیادی سوال نے ہمیں مبہوت کر دیا ہے کہ انسانی دماغ کی مشینری کو آخر کنٹرول کہاں سے کیا جاتا ہے۔

برین میپنگ سے ہم یہ تو پتہ چلا سکتے ہیں کہ کسی شخص کے اندرونی جذبات میں کس نوعیت کے تغیرات ہو رہے ہیں۔ اس کے تصور میں کوئی مایوس کن ویرانی ہے یا سرسبز و شاداب ہرے بھرے باغ۔ وہ دشمن سے انتقام لینے کی اسکیم بنا رہا ہے یا تصور جاناں کے خوشگوار احساس میں گرفتار ہے۔ پروزک اور ریٹالین جیسی دواؤں کے استعمال سے ہم اس کے انبساط میں حیرت انگیز اضافہ بھی کر سکتے ہیں بلکہ ایک قدم اور آگے بڑھاتے ہوئے ہیروئن اور دوسری تیز آور مسکّرات کے انجکشن سے ایک ایسی کیفیت بھی پیدا کر سکتے ہیں جس پر سالک کو مشاہدۂ حق کا گمان ہو کہ یہ سب کچھ دماغ میں سیروٹنین کی سطح کے اتار چڑھاؤ پر منحصر ہے۔ میکانیکی انداز سے اگر دیکھئے تو عالم خواب یا بے ہوشی میں آپ ان چیزوں کے ہلو سے سے بھی لطف اندوز ہو سکتے ہیں جسے عملی زندگی میں آپ نے کبھی دیکھا بھی نہ ہو۔ بعض اہل علم نے تو یہ بھی دعویٰ کر رکھا ہے کہ انھوں نے عالم سکر کی حقیقت معلوم کر لی ہے۔ آکسیجن کی مسلسل کمی کے سبب دماغ کی کارکردگی متاثر ہوتی ہے جس کی جھلک آنکھوں میں نمایاں ہو جاتی ہے لیکن ان تمام تحقیقات کے باوجود مہبطِ شعور کے سلسلے میں اب تک ہم کسی واضح نشاندہی سے عاجز ہیں۔ دیکھا جائے تو نیوروسائنس کی توجہ اب تک دماغ کے ہارڈ ویئر پر مرکوز رہی ہے۔ کیمیائی ادویہ کی مداخلت سے سافٹ ویئر کا اندازہ ابھی بالکل ابتدائی مرحلہ میں ہے۔ رہی یہ بات کہ دل و دماغ کا یہ نظام جب ایک بار خراب ہو جاتا ہے تو اسے reboot کیوں نہیں کیا جا سکتا؟ یہ اسی وقت معلوم ہو سکتا ہے جب ہمیں یہ پتہ ہو کہ مہبطِ شعور ہے کہاں اور یہ boot کیسے ہوتا ہے۔

اسٹیفن ہاکنگ نے اپنی مشہور زمانہ تالیف *A Brief History of Time* میں جواب بعض نئے اضافوں کے ساتھ *A Briefer History of Time* کے نام سے شایع ہوگئی ہے، اس آرزو کا اظہار کیا ہے کہ کاش ایک ایسے راس الکلیہ کا پتہ چل سکتا تو ہم اس پوزیشن میں ہوتے کہ اس سوال کا جواب فراہم کر سکیں کہ یہ کائنات جیسی کے یہ

ہے آخر بنائی ہی کیوں گئی ہے؟ اس بارے میں ہمارے علمی سفر کا اب تک ماحصل superstring theory کی شکل میں سامنے آیا ہے جس کی حقیقت ہاکنگ کے خیال میں بس کچھ اتنی ہی ہے جیسے کوئی یہ کہے کہ کچھوؤں کے کوہِ بلند پر ہماری سپاٹ زمین ٹکی ہوئی ہے۔ string theory کو لوگ سنجیدگی سے لیتے ہیں حالانکہ کچھوے کے کوہِ بلند کی طرح اس کے حق میں بھی کوئی تجرباتی شہادت موجود نہیں ہے۔ ملاحظہ کیجئے: Stephen Hawking with Leonard Mlodinow, *A Breifer History of Time*, London, 2008, pp. 138, 139.

۱۸۔ اشارہ ہے آیت 8-7، الروم

۱۹۔ قرآن مجید میں دنیا و آخرت دونوں الفاظ یکساں تعداد میں یعنی ۱۱۰ مرتبہ وارد ہوئے ہیں۔

۲۰۔ ایک برطانوی عیسائی فرقہ جو The Lord's Wilnesses کے نام سے جانا جاتا ہے اس کا کہنا ہے کہ بائبل میں ایسے پوشیدہ کوڈ موجود ہیں جس کی بنیاد پر دنیا کے خاتمے کا دن متعین کیا جا سکتا ہے۔ اس کے اعداد و شمار کے مطابق حضرت آدم کی پیدائش سال ۴۰۲۷ ق م میں ہوئی تھی اور نسل انسانی کا خاتمہ سال ۲۰۰۸ء میں ہو جانا تھا۔ آج ۲۰۱۰ء میں اس پیش گوئی کو نقل کرتے ہوئے مجھے پوپ لیونہم کی وہ بات یاد آ رہی ہے جب انھوں نے ۱۵۱۴ء میں کہا تھا کہ ''میں دنیا کا خاتمہ نہیں دیکھ سکوں گا، نہ تم میرے بھائی اس حقیقت کا مشاہدہ کر پاؤ گے، اس لیے کہ اس واقعہ کو آج سے ٹھیک پانچ سو سال بعد انجام پانا ہے۔'' اس قول کے مطابق قیامت کا ظہور ۲۰۱۴ء میں ہونا چاہیے۔

ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا جب ۶ رجون ۱۹۹۸ء میں لوگ Eli Esho کی متعین کردہ قیامت کا انتظار کرتے رہے۔ Eli Esho نے سرّی عدد ۶۶۶ کی بنیاد پر یہ قیاس آرائی کی تھی کہ اب چونکہ دنیا ۶ رجون ۱۹۹۸ء کو ختم ہونے والی ہے سو لوگ دوسری دنیا کی تیاری کر لیں۔ بہت سے لوگوں نے اپنے گھر بار بیچ ڈالے لیکن قیامت وقوع پذیر نہ ہوئی۔

۲۱۔ سال ۲۰۰۸ء میں یونیورسٹی آف سسیکس (برطانیہ) کے چند ماہرین فلکیات نے پروفیسر رابرٹ اسمتھ کی قیادت میں اس خیال کا اظہار کیا کہ اب تک کی تمام تحقیقات کے جوڑ گھٹاؤ سے انھوں نے دنیا کی عمر معلوم کر لی ہے۔ اس اندازے کے مطابق سورج جو مسلسل نمو پذیر ہے اس کے سائز میں بیس فیصد تک اضافہ ہو سکتا ہے جس کے نتیجے میں اس کی حرارت تین ہزار گنا زیادہ ہو جانے کا امکان ہے۔ اگر ایسا ہوا تو ایک بلین سال کے بعد زمین کے گرد درجہ حرارت کئی سو ڈگری سیلسیئس تک جا پہنچے گا۔ زمین آب و ہوا سے خالی ہو جائے گی۔ زندگی کا وجود ختم ہو جائے گا۔ سورج کے حجم میں جوں جوں اضافہ ہوتا جائے گا اس کی قوتِ کشش بڑھتی جائے گی اور بالآخر زمین کو اپنے اندر کھینچ کر جذب کر لے گا۔ دنیا کا یہ متوقع خاتمہ اب سے کوئی ۶–۷ بلین سال بعد وقوع پذیر ہوگا۔ ملاحظہ کیجئے: Jason Palaver, "Hope dims the Earth will Survive Sun's Death", New Scientist, 22 Feb. 2008.

۲۲۔ حروف مقطعات کی بعض عددی تفہیم کے مطابق سال دو ہزار دو سو اسّی ۲۲۸۰ء میں دنیا کو ختم ہو جانا ہے۔ رشاد خلیفہ

نے اپنے مطالعۂ قرآن کی بنیاد پر یہ دعویٰ کیا ہے کہ وہ قرآن مجید کے اندر پوشیدہ حروف کی عددی تنظیم کا پتہ لگانے میں کامیاب ہوگئے ہیں جس کے سبب اس سرالاسرار سے ان کی واقفیت ممکن ہوسکی ہے۔ بقول رشاد خلیفہ اس سرالاسرار کی کلید علیھا تسعتہ عشر کی قرآنی آیت ہے اور یہ کہ پورا قرآن انیس کی ترتیب و تنظیم میں مربوط ہے۔ البتہ جب اس خیال کی توثیق سورہ توبہ کی آیات ۱۲۹–۱۲۸ ﴿لقد جاء کم رسول من انفسکم .... رب العرش العظیم﴾ سے نہ ہوسکی تو انھوں نے اپنے ترجمۂ قرآن کے دوسرے ایڈیشن (۱۹۸۹ء) میں انھیں یہ کہہ کر مصحف سے خارج کر دیا کہ یہ آیات اصل مصحف میں اضافہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ انھیں ایسا کرنے کی جرأت شاید اس لیے ہوئی کہ ان آیات کے سلسلے میں ہماری روایت کی کتابوں میں پہلے سے ہی روایات کا ذبہ موجود تھیں۔

رشاد خلیفہ کا بنیادی نقطۂ نظر یہ ہے کہ سارا قرآن ۱۹ کے ہندسہ کے گرد گردش کرتا ہے جس کی تفہیم کے بغیر فہم قرآنی کا حق ادا نہیں ہوسکتا۔ قدیم یہودی تصوف اور بائبل کوڈ کی بحثوں کے زیر اثر وہ اس خیال کے داعی بن بیٹھے کہ انیس کی جمع تفریق اور ضرب تقسیم کے ذریعے انھیں سرالاسرار تک رسائی حاصل ہوگئی ہے کہ قرآن کی ۱۱۴ سورتیں ۶×۱۹ کا ماحصل ہیں۔ اس کی کل ۶۳۴۶ آیات ۳۳۴×۱۹ کا ماحصل ہیں۔ رسولؐ اللہ کو آنے والی پہلی وحی ۱۹ الفاظ پر مشتمل تھی جو ۷۶ حروف پر مشتمل ہے جسے ۱۹ سے تقسیم دیا جا سکتا ہے اور جسے پہلی وحی ہونے کے باوجود ترتیب میں ۹۶ پر رکھا گیا ہے جو ایک بار پھر ۱۹ سے تقسیم دیا جا سکتا ہے۔ قرآن مجید میں خدا کا نام ۲۶۹۸ مرتبہ آیا ہے جو دراصل ۱۴۲×۱۹ کا ماحصل ہے۔ قرآن مجید میں لفظ قرآن ۳۸ سورتوں میں آیا ہے جو ۲×۱۹ کا ماحصل ہے اور لفظ قرآن ۵۷ مرتبہ وارد ہوا ہے جو دراصل ۳×۱۹ کا ماحصل ہے۔ وقس علی ھذا۔

رشاد خلیفہ نے انیس کی اس مفروضہ دریافت یا اِلقا کی بنیاد پر اس بات کا دعویٰ کیا کہ وہ نہ صرف یہ کہ رازِ قرآن دریافت کرنے والے پہلے انسان ہیں بلکہ اللہ نے انھیں اس پیغام رسائی کے لیے پیامبر کی حیثیت سے مامور کیا ہے۔ اور یہ کہ وہ اپنے اس منصبِ عظیم کے سبب یہ بھی بتا سکتے ہیں کہ قیامت کب برپا ہوگی۔ انھوں نے اس خیال کا اظہار کیا کہ شق القمر کی پہلی علامت ۱۹۶۹ء میں اس وقت ظاہر ہوئی جب انسان چاند سے پتھر کا ایک ٹکڑا لانے میں کامیاب ہوگیا۔ چاند کے اس ٹکڑے کا چاند سے الگ ہونا گویا شق القمر کا عمل تھا۔ ثانیاً انیس کا قرآنی کوڈ ﴿علیھا تسعۃ عشر﴾ بھی اسی دوران کمپیوٹر کی ایجاد کے ذریعے ظاہر ہوا۔ انھوں نے یہ بھی دعویٰ کیا کہ قرآن مجید میں دابۃ سے مراد یہی کمپیوٹر ہے جس کے ذریعے قرآن کوڈ کی افشائی ممکن ہوسکی ہے۔ اور جس کے سبب رشاد خلیفہ کو یہ توفیق ہوسکی کہ وہ ۱۹ کی بنیاد پر اپنے التباسات کی دھند وحی ربانی کے گرد قائم کرسکیں۔ البتہ ایسا کرنے میں انھیں تاریخ و آثار کی کتابوں سے وافر مدد ملی۔ سبعا من المثانی سے انھوں نے یہ استدلال کیا کہ قیامت کے برپا ہونے کا وقت تو قرآن مجید میں موجود ہے البتہ اب تک وہ لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل تھا۔ ان کے مطابق یہ سبعا من المثانی قرآن مجید میں پائے جانے والے چودہ حروف مقطعات ہیں جن کی عددی قدر کچھ اس طرح ہے۔

حروف مقطعات کا جدول

حروف مقطعات	عددی قدر
ق	۱۰۰
ن	۵۰
ص	۹۰
ح م	۴۸
ی س	۷۰
طٰہٰ	۱۴
طٰس	۶۹
الٓم	۷۱
الٓر	۲۳۱
طٰسٓم	۱۰۹
ع س ق	۲۳۰
الٓمٓص	۱۶۱
الٓمٓر	۲۷۱
ک ہٰ ی ع ص	۱۹۵
مجموعی قدر	۱۷۰۹

ان تمام حروف کا مجموعی قدر ۱۷۰۹ ہوتا ہے۔ گویا یہ اس بات کا اعلان ہے کہ اس قرآنی اطلاع کے بعد ﴿وان الساعة لأتية فاصفح الصفح الجميل﴾ دنیا ۱۷۰۹ قمری سال تک باقی رہے گی۔ بالفاظ دیگر ۱۷۰۹ ہجری بمطابق ۲۲۸۰ء میں دنیا کا خاتمہ یقینی ہے۔

ہمارے خیال میں رشاد خلیفہ اور ان کا دریافت کردہ ۱۹ کا راز اس عہد کی پیداوار ہے جب کمپیوٹر کو ہماری زندگی میں ایک نئے معجزے کی حیثیت سے قبول کیا جا رہا تھا۔ اس دور میں جس کسی نے بھی سائنس کے ذریعے مذہب کی تصدیق کی کوشش کی وہ عالم عرب میں ہیرو قرار پایا۔ علم الاعداد ہمارے یہاں کوئی نیا فن نہ تھا کہ یہودی تصوف کے زیر اثر قرآنی نقوش اور آیتوں کے زائچوں کی روایت تو ہمارے یہاں صدیوں سے پائی جاتی تھی۔ جب رشاد خلیفہ نے کمپیوٹر کو اس خدمت پر مامور کیا تو ابتداءً انھیں عالم عرب خصوصاً لیبیا، مصر اور سعودی عرب میں

غیر معمولی مقبولیت ملی۔ البتہ جب ۱۹ کے اعداد و شمار کے تیشے متنِ قرآن پر چلنے لگے اور سورہ توبہ کی آخری دو آیتیں متنِ قرآنی سے باہر بتائی جانے لگیں تو مسلمان اس سلسلے میں خاصے محتاط ہو گئے۔ دیکھا جائے تو رشاد خلیفہ نے بنیادی طور پر ان التباسات کو کامیابی کے ساتھ استعمال کرنے کی کوشش کی جو پہلے ہی سے ہمارے اسلاف کی کتابوں میں پائی جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر بیضاوی کی تفسیر (مطبوعہ ۱۳۱۸ھ، ج ۷، ص ۱۰) اور سیوطی کی اتقان میں یہ روایت موجود ہے کہ مدینہ میں ایک یہودی ایک بار رسولؐ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا کہ آپ کے قرآن میں ابتداءً (ا،ل،م) آلـم کے حروف وارد ہوئے ہیں جس کا عددی قدر ا=۱، ل=۳۰، میم=۴۰ گویا مجموعی طور پر ۷۱ بنتا ہے جس سے یہ پتہ لگتا ہے کہ آپ کا دین ۷۱ سالوں تک زندہ رہے گا۔ رسولؐ اللہ نے کہا کہ ہمارے پاس ا،ل،م،ص (الـمـص) بھی ہے۔ کہنے لگا کہ ا=۱، ل=۳۰، م=۴۰، ص=۹۰ گویا مجموعی طور پر اس کا قدر ۱۶۱ بنتا ہے۔ انھوں نے پوچھا کیا آپ کے پاس کچھ اور بھی ہے؟ رسولؐ اللہ نے کہا ہاں ا،ل،م،ر (الـمـر) کہنے لگے ارے یہ تو کہیں زیادہ وزنی ہے۔ ا=۱، ل=۳۰، م=۴۰ اور ر=۲۰۰ گویا اب مجموعی قدر ۲۷۱ بنتا ہے۔ بالآخر وہ یہ کہتے ہوئے چلا گیا کہ ہمیں نہیں معلوم کہ انھیں اس طرح کے کتنے مقطعات عطا کئے گئے ہیں۔ اس قسم کی روایتوں نے، جو ہماری ثقہ کتابوں میں بدقسمتی سے راہ پا گئی ہیں، صدیوں سے بے بنیاد قیاس آرائیوں کے لیے مواد فراہم کر رکھا ہے۔

۲۳۔ ۱۹۹۷ء میں امریکہ میں فرقۂ باب جنت (Heaven's Gate Cult) کی اجتماعی خودکشی نے دنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ مارشل ایپل وائٹ جو اس فرقہ کا سربراہ تھا وہ اپنے ان ۳۸ متبعین کو یہ یقین دلانے میں کامیاب ہو گیا تھا کہ کرۂ ارض کا از سرِ نو احیاء ہونے والا ہے۔ اس وقت زمین پر رہنا مناسب نہیں۔ وقت آ گیا ہے کہ ہم لوگ زمینی زندگی سے ماوراء وجود کی ایک دوسری سطح پر جینے کا اہتمام کریں۔ مارشل ایپل وائٹ کے مطابق اڑن طشتری کے مثل ایک خلائی سیارہ زمین کے اردگرد چکر لگا رہا ہے تاکہ وہ ایسی روحوں کو حیات کی دوسری ابعاد میں داخل کرنے کے لیے لے جا سکے۔ ان لوگوں کا اس بات پر اتنا واثق ایمان تھا کہ انھوں نے ہنسی خوشی زمین سے ہجرت کے شوق میں اجتماعی خودکشی کا اہتمام کر ڈالا۔ ملاحظہ کیجئے: Irving Hexham and Karla Poewe, UFO Religion-Making Sense of the Heaven's Gate Suicides, Christian, May 7, 1997, p. 739–440.

۲۴۔ ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے جب ملینیئم بگ (Millanium Bug) کے خوف سے ہماری جدید دنیا لرزاں بہ اندام تھی۔ خیال کیا جاتا تھا کہ گھڑی کی سوئی جس لمحہ سال ۱۹۹۹ء کے خاتمہ کا اعلان کرے گی جدید دنیا کا کمپیوٹر زدہ نظام اچانک زمین بوس ہو جائے گا۔ ایسا اس لیے کہ کمپیوٹر بنانے والوں نے اپنے سافٹ ویئر میں Memory کی تنگی کے سبب ایک نئے ملینیئم کے لیے اہتمام نہ کیا تھا۔ ۱۹۹۹ء کے بعد ۹۹ کا ہندسہ جب ۰۰ میں تبدیل ہوگا تو کمپیوٹر یہی سمجھے گا کہ وہ اچانک سال ۱۹۰۰ میں داخل ہو گیا ہے۔ یہ تاریخ اس کے لیے حیرت و استعجاب کا باعث ہوگی۔ کیا پتہ

اس تبدیلی سے وہ کیا اشارہ سمجھے۔ کسی نے کہا کہ اس نامانوس تاریخ کے نتیجے میں ہوسکتا ہے کمپیوٹرزدہ خودکار نظام جس سے گھریلو استعمال کی مشینوں سے لے کر بالسٹک میزائل تک مربوط ہیں، ایسے اقدامات کی شروعات کردے جس کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ کسی نے کہا کہ نامانوس سال کے نتیجے میں ہوسکتا ہے کہ کمپیوٹر سے مربوط تمام ہی نظام زندگی اچانک کام کرنا بند کردے اور اس طرح جدید زندگی کی رمق جہاں ہوائی جہاز سے لے کر ہسپتال اور بجلی سپلائی سے لے کر میونسپل خدمات تک سبھی کچھ کمپیوٹر کے دم سے رواں دواں ہے اچانک تہہ و بالا ہوکر رہ جائے۔ امریکہ میں یہ پروپیگنڈہ اتنے زور و شور سے اٹھا کہ لوگ گنجان شہروں سے قریوں کی طرف ہجرت کا پروگرام بنانے لگے۔ انھوں نے ضروریات زندگی کے لیے ساز و سامان اکٹھا کرنا شروع کردیا۔

بعض مذہبی حلقوں نے نئے ملینیئم سے پہلے اس مکمل تباہی کو ظہور قیامت کا شاخسانہ بتایا۔ کسی نے کہا کہ مسیح کی آمد ثانی کا وقت اب قریب آپہنچا ہے اور کسی نے Bill Gates کو ظہور دجال پر محمول کیا جس کے قائم کردہ نظامِ طلسم کے خاتمہ کا وقت اب قریب دکھائی دیتا تھا اور جو اس بات کی دلیل تھی کہ اس مصنوعی سائنسی طلسماتی دنیا کے زوال کے بعد مسیح کی آمد کا راستہ ہموار ہوجائے گا۔

۲۵۔ میان (Mayan) کیلنڈر کے مطابق دنیا کی کل عمر ۱۳ بکتون قرار پاتی ہے۔ ایک بکتون میں ۱۴۴ ہزار دن ہوتے ہیں۔ ان کے یہاں ۳۶۰ دنوں کا ایک سال اور ۲۰ دنوں کا ایک مہینہ ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس تقویم کی ابتداء ۳۱۱۴ اگست تیرہویں صدی ق م میں وینس کی پیدائش کے وقت سے کی جاتی ہے۔ ان کے اعداد و شمار کے مطابق دنیا کا خاتمہ ۲۰۱۲ء میں ہوجانا چاہیے۔

۲۶۔ A. J. Wensinck, "Kibla," in*The Encyclopeadia of Islam* vol. 5 Leiden, E.J. Brill, 1960), pp. 189-93.

۲۷۔ Suliman Bashear, "Qibla Musharriqa and Early Muslim Prayer in Churches", *The Muslim World*, 81, no. 3-4 (1991) :268.

۲۸۔

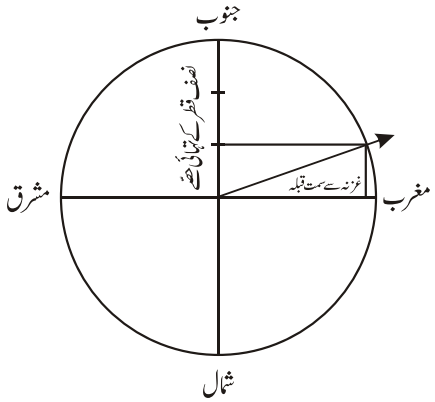

کتاب تحدید الاماکن میں تعین قبلہ کے لیے البیرونی کا وہ طریقہ جس کے ذریعہ اس نے غزنہ سے مکہ کی سمت دریافت کی۔

۲۹۔ David A. King, *Astronomy in the Service of Islam* (Brookfield, 1993), p.257

۳۰۔ David A. King, *In Synchrony with the Heavens: Studies in Astronomical Timekeeping and Instrumentation in Medieval Islamic Civilization* (Leiden, Netherlands: E. J. Brill, 2004), p.215.

۳۱۔ الخوارزمی (متوفی ۸۴۷ء) اور البطانی (متوفی ۹۲۹ء) نے مختلف علاقوں سے تعین قبلہ کے لیے جو جدولیں تیار کی تھیں وہ آگے چل کر حبش الحسیب (متوفی ۸۶۴ء) ابن الہیثم (متوفی ۱۰۴۰ء) اور البیرونی (متوفی ۱۰۵۰ء) کے ہاتھوں مزید فنی باریکیوں کے ساتھ مرتب ہوئیں۔ یہاں تک کہ تیرہویں صدی میں ابوعلی المراقشی کی نئی تحقیق اور نئے فارمولے کی بنیاد پر دمشقی موقیت الخلیلی نے مختلف علاقوں کے لیے سمت قبلہ کے تعین کا حیرت انگیز جدول تیار کر ڈالا۔ Samso, Julio. "Astronomical Tables and Theory." in *The Different Aspects of Islamic Culture.* Vol. 4: Science and Technology in Islam. (Ed. A.Y. Alhasan) Part 1: The Exact Sciences, Paris: UNESCO, pp. 209-234.

۳۲۔ علم المیقات کے سلسلے میں چشم کشا مباحث کے لیے دیکھئے: David A. King, *Astronomy in the Service of Islam* اور *In synchrony with the Heavens.*

۳۳۔ اوقات صلوٰۃ کی تحدید ہی پر کیا موقوف ابتدائے عہد میں دن اور رات کے مختلف پہروں کا تعین بھی کوئی آسان کام نہ تھا۔ دن میں سورج کے گھٹتے بڑھتے سائے اور رات میں تاروں کے مقام سے آگہی تحدید وقت کا واحد ذریعہ تھا۔ گویا آسمان کا جتنا باریک بینی سے مشاہدہ کیا جا سکے تحدید وقت میں کامیابی کا اتنا ہی زیادہ امکان نظر آتا تھا۔ زمین سے مختلف سیارے اپنا زاویہ کس طرح بناتے ہیں اس کی پیمائش پر سب کچھ منحصر تھا۔ وہ اس طرح کہ اگر ایک مثلث کے ایک کنارے ایک تارا ہو اور دوسرے کنارے پر قطبِ عالم تو پھر تیسرے کنارے سے اس بات کا پتہ لگایا جا سکتا ہے کہ مذکورہ تارا کس بلندی تک پہنچتا ہے۔ اس حساب کتاب کے لیے Trigonometry کا علم وجود میں آیا اور پھر قدیم اسٹرلوب میں اتنی گنجائش پیدا ہوگئی کہ وہ صحیح وقت کا پتہ دے سکے۔ کچھ یہی پیچیدگی سمت قبلہ کے تعین میں پائی جاتی تھی۔ زمین جو ایک بیضوی سطح کی حامل ہے اس کی سطح پر دور دراز کے ملکوں سے قبلہ کے تعین کے لیے Spherical Geometry کا علم وجود میں لایا گیا۔ یہاں بھی تاروں کی مدد سے پیچیدہ اعداد و شمار کے ذریعے بالآخر گوہر مقصود ہاتھ آ گیا۔ کہا جاتا ہے کہ نویں صدی میں مسلم ماہرین فلکیات اس لائق ہو گئے تھے کہ Trigonometry کے ذریعے مختلف بلاد و امصار سے سمت قبلہ کا تعین کر سکیں۔ اس سلسلے میں البطّانی کا نام خصوصیت کا حامل ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھئے۔

David King, *In Synchrony with the Heavens: Studies in Astronomical Timekeeping and Instrumentation in Medieval Islamic Civilization.* 2 vols. Leiden, 2004.

۳۴۔ مثال کے طور پر تقسیم وراثت کے سلسلے میں مروجہ ریاضی کی تنگنائی کا تذکرہ کرتے ہوئے خوارزمی نے ایک دقیق حل طلب مسئلہ یوں متعارف کرایا ہے۔فرض کریں کہ ایک شخص جو بسترِ مرگ پر ہے اپنے دو غلاموں سے یہ معاہدہ کرتا ہے کہ وہ تین سو درہم کی ادائیگی پر آزاد تصور کیا جائے گا۔اس میں سے ایک غلام مر جاتا ہے اور اپنے پیچھے ایک بچی اور دو بچوں کو چھوڑ جاتا ہے اور ساتھ میں چار سو درہم کا ترکہ بھی اور تبھی اس کا پرانا آقا بھی داعیٔ اجل کو لبیک کہتا ہے اور وہ اپنے پیچھے تین بیٹیوں اور تین بیٹوں کو چھوڑتا ہے۔اب ایسی صورت میں ان بچوں میں سے فی کس کس کو کتنا ملے گا۔اس قسم کی صورتحال سے نمٹنے کے لیے الخوارزمی نے الجبر والمقابلہ کا فن ایجاد کیا جس کے ذریعہ بظاہر دماغ بافتہ سوالات کو آسان طریقے سے حل کرنا ممکن ہو گیا۔

۳۵۔ خوارزمی، الجبر والمقابلہ، ۱۹۸۹ء ص ۴۔

۳۶۔ دوسرے مسلم علمائے سائنس کی طرح البتانی بھی اس نکتے سے پوری طرح آگاہ تھے کہ فلکیات و نجوم کا مطالعہ ایک خدا شناس کا فطری وظیفہ ہے جیسا کہ قرآنی آیات سے استشہاد کرتے ہوئے انہوں نے اپنی مشہور زمانہ زیج کے ابتدائیہ میں لکھا ہے:إن من أشرف العلوم منزلة وأسناها مرتبة وأحسنها حلية وأعلقها بالقلوب وألمعها بالنفوس وأشدها تحديداً للفكر والنظر وتذكية للفهم ورياضة للعقل بعد العلم بما لا يسع الإنسان جهله من شرائع الدين وسنته علم صناعة النجوم لما في ذلك من جسيم الحظ وعظيم الانتفاع بمعرفة مدة السنين والشهور والمواقيت وفصول الأزمان وزيادة الليل والنهار ونقصانها ومواضع النيرين وكسوفها ومسير الكواكب في استقامتها ورجوعها وتبدل أشكالها ومراتب أفلاكها وسائر مناسباتها إلى ما يدرك بذلك من أنعم النظر وأدام الفكر فيه من إثبات التوحيد ومعرفة كنه عظمة الخالق وسعة حكمته وجليل قدرته ولطيف صنعه قال عز من قائل ﴿إن في خلق السموات والأرض واختلاف الليل والنهار لآيات لأولي الألباب﴾ وقال تبارك وتعالى ﴿تبارك الذي جعل في السماء بروجا﴾ وقال عز وجل ﴿هو الذي جعل الليل والقمر نوراً خلفة﴾ وقال سبحانه ﴿هو الذي جعل الشمس ضياء والقمر نوراً وقدره منازل لتعلموا عدد السنين والحساب﴾ وقال جل ذكره ﴿والقمر بحسبان﴾ مع اقتصاص كثير في كتاب الله عز وجل يطول وصفه ويتسع القول بذكره واستشهاده....(زيج البتانی، الباب الأول)

۳۷۔ تاریخی تذکروں میں نصیر الدین طوسی کی علمی عظمت ان کی سیاسی شخصیت کے تابع ہو کر رہ گئی ہے بالخصوص سقوط بغداد میں ان کی منفی سیاست کے سبب عامۃ الناس میں ان کی شخصیت مسموم رہی ہے ورنہ واقعہ یہ ہے کہ ان کی شخصیت میں کتاب الٰہی اور کتاب فطرت کے علوم مجتمع ہو گئے تھے۔اگر ایک طرف فلکیات پر ان کی تالیفات اساسی نوعیت کی ہیں تو دوسری طرف روضة التسليم، سير وسلوك، اوصاف الاشرف اور تجريد الاعتقاد جیسی کتابیں

اس امر کا پتہ دیتی ہیں کہ ان کا شمار وقت کے اہم ترین اسمٰعیلی علماء میں ہوتا تھا۔

۳۸۔ تاریخ کے ایک طالب علم کو حیرت ہوتی ہے کہ مسلم مورخین نے آخر کیونکر عبداللہ بن زبیر کو ہماری سیاسی تاریخ سے محو کر رکھا ہے۔ حالانکہ کوئی ساڑھے نو برس تک وہ عالم اسلام کے ایک بڑے حصّے بشمول حجاز پر حکمراں رہے۔ زہد و تقویٰ، علم و فضل کی میزان پر بھی وہ عبدالملک سے کہیں فائق نظر آتے ہیں۔ اس عہد میں ان کے استحقاق حکمرانی کا دعویٰ اتنا وزنی سمجھا جاتا تھا کہ عبدالملک نے لوگوں کو اس خوف سے حج پر جانے سے روک دیا تھا مبادا وہ ابن زبیر کی باتوں سے متاثر نہ ہو جائیں اور اس طرح بلاد شام کا علاقہ بھی اس کے ہاتھوں سے جاتا رہے۔ بات جب خراب ہونے لگی اور لوگوں نے حج سے روکے جانے پر احتجاج کیا تو عبدالملک نے بیت المقدس کو ایک متبادل زیارت گاہ کے طور پر متعارف کرایا اور اس قبیل کی روایتیں عام کی گئیں کہ رسول اللہؐ نے تین مسجدوں کی زیارت کے لیے سفر کا حکم دیا ہے اور یہ کہ بیت المقدس کی وہ چٹان جس پر قدم رکھ کر رسول اللہؐ نے آسمان کی طرف معراج کیا تھا فضیلت میں کعبہ کے ہم پلّہ ہے۔ یعقوبی نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ عبدالملک نے اس چٹان پر ایک خوبصورت گنبد بنوا دیا اور اہل شام کو اس چٹان کے گرد طواف کی ترغیب دی۔ کہا جاتا ہے کہ اس ترغیب و تحریص کے نتیجے میں اہل شام کے وفود مسجد اقصیٰ کی زیارت کے لیے پہنچنے لگے۔ حتیٰ کہ عیدالاضحیٰ کے موقع پر وہاں طواف کے ساتھ قربانی اور حلق کا رواج بھی شروع ہو گیا۔ گنبد میں جنت، جہنم اور پل صراط کی خیرہ کن تصویریں بنائی گئیں اور اس طرح اہل شام کو کعبہ کے مقابلے میں ایک متبادل زیارت گاہ ہاتھ آ گئی۔ وہ تو کہئے کہ عبدالملک کو جلد ہی حجاز مقدس پر تسلط حاصل ہو گیا جس کے سبب اس متبادل زیارت گاہ کی حاجت باقی نہ رہی ورنہ حکمرانِ وقت کی یہ سیاسی مصلحت حج کی صورت شکل بھی مسخ کر دیتی۔

مزید تفصیل کے لیے دیکھئے تاریخ یعقوبی، ج ۲، ص ۱۶۱ اور البدایہ والنھایہ، ج ۸، ص ۲۸۱۔

۳۹۔ تاریخ کے متداول مآخذ سے پتہ چلتا ہے کہ عبدالملک کے عہد تک بصرہ اور کوفہ میں مالیات اور محصولات کے رجسٹر بزبان فارسی اور شام میں بزبان یونانی لکھے جاتے تھے۔ زاذان فروخ نامی ایک فارسی بصرہ میں مالیات کا ذمہ دار تھا جب کہ دمشق میں اس عہدہ پر ایک عیسائی سرجون بن منصور کو مامور کیا گیا تھا۔

۴۰۔ بلاذری، ص، ۲۴۹

۴۱۔ تاریخ کی کتابوں میں خالد بن یزید بن معاویہ کا تذکرہ ایک ایسے عالم کی حیثیت سے آتا ہے جنھیں دھاتوں کے خواص کی گہری معلومات تھی۔ ایک موقع پر انھوں نے عبدالملک بن مروان کو یہ مشورہ بھی دیا تھا کہ وہ نئے سکّے پر سورہ اخلاص کندہ کرائیں۔ (ابو ہلال العسکری، کتاب الاوائل، بیروت، ۱۹۹۷ء، ص ۱۸۵)۔

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ خالد بن یزید کی کیمیا میں دلچسپی اساطیری الکیمی کے سبب تھی جس کے زیر اثر تاریخ کے مختلف ادوار میں بہت سے لوگ سستی دھاتوں کو کسی اساطیری فارمولے کے ذریعے سونے میں بدل ڈالنے کے متمنی دکھائی دیتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ الکیمیا میں خالد کی تمام تر دلچسپی ایک نئے میعاری سکّے

کے قیام کے سبب تھی اور اسی ضرورت کے پیشِ نظر انھوں نے اس فن پر مروجہ بہت سی کتابوں کا ترجمہ کیا اور بالآخر ایک معیاری ٹکسال کے قیام میں اموی سلطنت کی بروقت دستگیری کی۔ کہا جاتا ہے کہ خالد بن یزید نے اہل روم کے آتشِ یونانی کے مقابلے میں نفیت (یا نفیط) نام کا ایک کیمیائی مرکب بھی تیار کر لیا تھا جو اچانک تیزی سے بھڑک اٹھتا تھا۔

۴۲۔ مثال کے طور پر قمری مہینوں کے تعین کے مسئلہ کو لیجیے۔ بطلیموس نے قمری مہینوں کی پیمائش کے لیے چاند گہن کا سہارا لیا ہے۔ اس کے مطابق دو چاند گہن کے دوران ۲۶،۰۰۷،۱ دن اور ایک گھنٹے کا فاصلہ ہوتا ہے۔ اس دوران چاند ۲۶۷،۴ مرتبہ گردش کر چکا ہوتا ہے۔ اگر ۲۶،۰۰۷،۱ دن اور ایک گھنٹے کو ۲۶۷،۴ سے تقسیم کیا جائے تو ایک قمری مہینہ ۲۹ دن ۳۱ منٹ، پچاس سیکنڈ، ۸ ثلاثی اور ۲۰ رباعی پر مشتمل ہوگا۔ (یعنی ۲۰،۸،۵۰،۳۱،۲۹) قمری مہینہ کی یہ پیمائش حجاج بن مطر کی اصلاح شدہ پیمائش ہے ورنہ بطلیموس کے مطابق ''دن'' کو ''گردش'' سے تقسیم دینے پر حاصل قدرے مختلف نکلتا ہے جو اس طرح ہے۔ (۲۰،۹،۸،۵۰،۳۱،۲۹) ملاحظہ کیجیے:

Bernard Goldstein, "Ancient and Medieval Values for the Mean Synodic Month", *Journal for the History of Astronomy*, 34 (2003): 65–74.

George Saliba, *Islamic Science and the Making of European Renaissance*, p. 79–80.

۴۳۔ یہ خیال عام ہے کہ مسلمانوں نے اپنے سیاسی جاہ و حشم کے زمانے میں علوم و فنون کو جو ترقی دی وہ ان کا اپنا طبع زاد کارنامہ نہ تھا بلکہ انھوں نے صرف اتنا کیا کہ عباسی خلافت کی ابتدائی دو صدیوں میں یونانی علوم و فنون کو بڑی سرعت کے ساتھ عربی میں منتقل کر دیا جس کے نتیجے میں عباسی بغداد میں ایک علمی غلغلہ کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ البتہ جب یہی علوم بعد کی صدیوں میں لاطینی میں ترجمہ ہو کر اہالیان یورپ کو منتقل ہو گئے تو مسلم تہذیب کی آب و تاب جاتی رہی کہ اس خیال کے مطابق مسلمانوں نے قدماء کے ان علوم کی محض حفاظت کی اور اس کے اطلاقی فوائد کشید کیے جب کہ یورپ نے ان علوم کو ترقی دے کر اکتشاف و تسخیر کی ایک بالکل ہی نئی دنیا بنا ڈالی۔ ہمارے خیال میں اس قسم کی باتوں پر آج وہی لوگ کان دھر سکتے ہیں جنھیں انسانی تہذیب کی تاریخ سے یکسر ناآگہی ہو یا پھر وہ تعصب اور پروپیگنڈے کا شکار ہوں۔ اولاً تو یہ خیال ہی باطل ہے کہ عہدِ عباسی کے تحریک ترجمہ سے پہلے فلکیات، جغرافیہ، ریاضی اور فنون لطیفہ کا جزیرۃ العرب اور اس سے باہر مفتوحہ علاقوں میں کوئی وجود نہ تھا۔ اہل مکہ کو ناخواندہ، جاہل اور اجڈ قوم باور کرانے میں ان بیانات کا بھی دخل ہے جو نیک نیتی سے جاہلیت کا ایک ایسا تصور پیش کرتے ہیں جہاں کوئی تہذیب کسی بھی شکل میں نہ پائی جاتی ہو۔ ہوسکتا ہے ایسی مبالغہ آرائی سے اسلام کے کارنامے کو اجاگر کرنے میں کچھ وقتی تقویت مل جاتی ہو لیکن ان بیانات کا تاریخی حقائق سے دور کا واسطہ بھی نہیں۔ قرآن مجید کا ایک معمولی قاری بھی اس بات کا بآسانی اندازہ لگا سکتا ہے کہ قرآن کے اولین مخاطبین شعر و شاعری اور ادب کا اعلیٰ ذوق رکھتے ہیں، شمس و قمر کی گردش سے مہینوں اور سالوں کی گنتی کے فن سے انہیں آگہی ہے۔ فلکیات کے علاوہ رمل، نجوم اور

کہانت سے وہ آشنا ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ ایک سے لے کر ایک لاکھ کی گنتی سے نہ صرف واقف ہیں بلکہ آیت وراثت کے اندرونی شواہد تو اس بات پر دال ہیں کہ وہ حصص کی پیچیدہ تقسیم کو بھی سمجھنے کے اہل ہیں۔ گویا قرآن مجید جیسی عظیم الشان علمی کتاب جس ماحول میں نازل ہو رہی تھی وہاں اس کی تفہیم کی بنیادی استطاعت مخاطبین میں لازماً پائی جاتی تھی۔

ابتدائی مسلم ذہن کی کم مائیگی اور بے بضاعتی کا پروپیگنڈہ ان مستشرقین نے بھی بڑے زور وشور سے کیا ہے جو زوال کی صدیوں میں ہمیں یہ باور کرانے پر مُصر رہے ہیں کہ تم نہ کل کسی لائق تھے اور نہ آج ہو سکتے ہو۔ کل یونانی علم وحکمت کے چراغ سے تم نے اپنا گھر روشن کر رکھا تھا تو آج مغرب کے علوم وفنون ہی تمہاری دادرسائی کر سکتے ہیں۔ بیشتر مستشرقین جو مسلم تہذیب کو یونانی علم وحکمت کا خوشہ چیں بتاتے ہیں ان کی فکری جڑیں دراصل Goldziher کی تحریروں میں پائی جاتی ہیں۔ جو اسلامی عہد کی تمام اکتشافی اور سائنسی ترقیوں کو اجنبی علوم (Foreign Sciences) کی حیثیت سے دیکھتا ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

"The Attitude of Orthodox Islam Toward the 'Ancient Sciences'" in Merlin L. Swartz, (ed). *Studies on Islam*. New York: Oxford University Press, 1981, pp.185-215.

بعد کے مستشرقین نے اپنے طور پر کوئی تحقیق کرنے کے بجائے کلی طور پر Goldziher کے اس خیال کو ایک حتمی صداقت کی حیثیت سے قبول کر لیا۔ یہی وجہ ہے کہ مغرب میں آج بھی یہ خیال عام ہے کہ اسلام اکتشافی ذہن کا مخالف ہے اور شاید اسی سبب موجودہ عالم اسلام میں کائنات پر غور وفکر اور اکتشاف وتسخیر کی روایت انتہائی ناگفتہ بہ ہے۔

اس خیال کے حاملین اس پروپیگنڈے کا اظہار کرتے نہیں تھکتے کہ یونانی علم وحکمت جب تک اسلامی تہذیب کو تابدار کرتے رہے ان کی ترقی ایک مخصوص سطح سے آگے نہ جا سکی لیکن یہی علوم جب عربی سے ترجمہ ہو کر لاطینی زبان میں یورپ کو منتقل ہوئے تو مغرب کے سائنسی مزاج نے اس سے بالکل ہی ایک نئی دنیا بنا ڈالی۔ اس طرح کی باتیں اگر ایک طرف استعمار کا سیاسی پروپیگنڈہ ہیں اور اس مصنوعی پندار کو قائم رکھنے کے لیے ان کی ضرورت ہے تو دوسری طرف تاریخ سے سخت ناواقفیت کا نتیجہ بھی۔ سچ تو یہ ہے کہ تحریک ترجمہ محض یونانی علوم کے تراجم کا نام نہیں تھی بلکہ ان تین سو سال پر مشتمل اس علمی تحریک نے روم وفارس کے مفتوحہ علاقوں میں پائے جانے والے تمام علوم وفنون کا احاطہ کر لیا تھا حتیٰ کہ ہند وچین کے علوم وفنون بھی مسلمانوں کی دسترس میں آ گئے تھے۔ بالفاظ دیگر یہ کہہ لیجئے کہ انسانی تہذیب اپنے ارتقائی سفر میں جہاں تک پہنچی تھی اس کا نہ صرف یہ کہ مسلمانوں نے بڑی حد تک احاطہ کر لیا تھا بلکہ قرآنی دائرہ فکر کی روشنی میں انھوں نے تحلیل وتجزیے کی ایک معروضی روایت بھی قائم کر ڈالی تھی۔ مروجہ علوم کو جوں کا توں قبول کرنے کے بجائے اسے قرآنی تصورات ومعتقدات کی روشنی میں استرادو قبول کا موضوع بنایا گیا۔ اب اس عمل میں انھیں کتنی کامیابی ہوئی یہ ایک الگ مسئلہ ہے جو سرِ دست ہمارے موضوع

بحث سے خارج ہے۔

۴۴۔ ابن الہیثم، الشکوك علی بطلیموس (تعلیق عبدالحمید صبرہ ونبیل شہابی) قاہرہ ۱۹۷۱ء

۴۵۔ جارج صلیبہ نے ایک قدیم غیر مطبوعہ مسودے کتاب الھیئہ میں پائی جانے والی اندرونی شہادت کے حوالے سے اس کتاب کے متداول ہونے پر مطلع کیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

George Saliba, *A History of Arabic Astronomy: Planetary Theories During the Golden Age of Islam,* New York University Press, 1994, p.20.

۴۶۔ اَلمُعَدِّل اَلمَسِیر جسے ہم قدیم فلکیات میں Equant کا مسئلہ کہتے ہیں اپنی تمام تر لغویت کے باوجود ایک طویل عرصے تک مشاہداتی علم سے مزاحم ہوتا رہا۔ حالانکہ فی نفسہٖ اس تصور کی حقیقت قیاس مع الفارق سے زیادہ کچھ بھی نہ تھی۔ اس سے زیادہ مہمل اور کیا بات ہوگی کہ یہ تصور کیا جائے کہ کوئی دائرہ جو یکساں رفتار سے اپنے خطوط پر کسی محور کی جانب محوِ خرام ہو وہ اس کے مرکز کو مس کئے بغیر اس سے گذر جائے۔ جارج صلیبہ، حوالہ مذکور ص ۸۵۔

۴۷۔ متکلمین نے عرض اور جوہر کی جو بحث قائم کی اس میں وقت کو بھی جوہری پیمانے میں متصوّر کیا گیا جہاں مسبب الاسباب خدائے وحدہٗ لاشریک کی ذات قرار پائی جو تمام عوامل کا سرچشمہ ہے۔ الرازی نے Absolute Space کا نظریہ پیش کیا جو ارسطو کے نظریۂ مکان کے مقابلے میں نیوٹن سے کہیں زیادہ قریب ہے۔

۴۸۔ ابن الہیثم، الشکوك علی بطلیموس، (تحقیق عبدالحمید صبرہ ونبیل شہابی) قاہرہ، ۱۹۷۱ء، ص ۶۳۔

۴۹۔ George Saliba, *Islamic Science and the Making of European Renaissance,* London, 2007, pp. 82-83.

۵۰۔ ابن الہیثم، الشکوك علی بطلیموس، قاہرہ ۱۹۷۱ء، ص ۳۸۔

۵۱۔ ابوجعفر البطروجی (متوفی ۶۰۰ھ) جسے مغرب میں Alpetragius کے نام سے جانا جاتا ہے، نے اپنی معرکۃ الآراء تالیف کتاب الحیاۃ میں بطلیموسی ماڈل کو یکسر مسترد کرتے ہوئے ایک نئے علم ہیئت کا ابتدائی خدوخال پیش کیا۔ اس کتاب کا لاطینی ترجمہ ۱۵۳۱ء میں وینا میں شائع ہو چکا تھا جبکہ اس کی ایک اور تصنیف کتاب الھیئۃ کا لاطینی ترجمہ مائیکل اسکوٹ کے ہاتھوں فریڈرک دوم کے صقلیہ میں تیرہویں صدی میں ہو چکا تھا۔ کوپرنکس، جس نے فلکیات کے مسلم متقدمین کے تذکرے میں خاصے تحفظِ ذہنی، ناسپاسی بلکہ سارقانہ ذہنیت کا مظاہرہ کیا ہے، جس کی طرف اشارہ ہم نے آگے ابن شاطر کے ضمن میں کیا ہے، اس کے لئے بھی بطروجی کو یکسر نظرانداز کرنا ممکن نہ ہو سکا۔ اپنی شہرۂ آفاق تصنیف *De Revolutionibus Orbium Coelestium* میں کوپرنکس نے لکھا ہے: Alpetragius superiorem sole Venerem facit, et inferiorem Mercurium یعنی البطروجی نے زہرہ کا مقام سورج سے اوپر اور عطارد کا نیچے متعین کیا ہے۔ کوپرنکس کا یہ اعتراف اس حقیقت کے اظہار کے لئے کافی ہے کہ البطروجی کا تصور کائنات افلاطون اور بطلیموس سے مختلف ہے جہاں اول الذکر نے ان دونوں سیاروں کو

سورج کے اوپر اور آخر الذکر نے دونوں کو نیچے رکھا ہے۔

۵۲۔ قرآن مجید میں حکمت کا لفظ کہیں تو الگ سے آیا ہے اور کہیں کتاب وحکمت کا تذکرہ یکجا کیا گیا ہے۔ جیسے ﴿ومن یوت الحکمة فقد اوتی خیراً کثیرا﴾ یا ﴿ویعلمهم الکتاب والحکمة﴾ (البقرۃ:۲۶۹)۔ قرآن مجید نے محمد رسول اللہؐ کو معلمِ کتاب وحکمت کے فرض منصبی پر مامور بتایا ہے کتاب سے مراد وحی ربانی پر مشتمل ایک ایسا معین وثیقہ ہے جس کے بارے میں التباس کی گنجائش کم ہے البتہ حکمت کے تعین کے سلسلے میں ہمارے متقدمین مختلف غلط فہمیوں کا شکار رہے ہیں۔ کسی نے کہا کہ حکمت قرآن کے علاوہ ایک اور مقابل ماخذ کی طرف اشارہ کرتا ہے اور پھر رفتہ رفتہ یہ خیال واثق ہوتا گیا کہ آپؐ پر کتاب وحکمت دو الگ الگ چیزیں نازل کی گئیں۔ ایک کا مجموعہ قرآن مجید کی شکل میں موجود ہے تو دوسرے کا اظہار سنن وروایات کی شکل میں ہوا ہے۔ اس خیال کو قبول عام کرنے میں قتادہ السدوسی متوفیٰ ۱۱۸ھ، ابن وہاب (تلمیذ امام مالک) متوفیٰ ۱۹۷ھ اور امام شافعی متوفیٰ ۲۰۵ھ کا خاص طور پر رول رہا ہے۔ ہمارے خیال میں حکمت کو سنت کا ہم معنیٰ قرار دینا اس لیے بھی صحیح نہیں ہے کہ قرآن مجید کے صفحات اس بات پر دال ہیں کہ کتاب وحکمت بیک وقت انبیاء سابقین کو بھی عطا کی جاتی رہی ہیں۔ مثال کے طور پر حضرت مسیحؑ کے سلسلے میں یہ کہنا کہ ﴿ویعلمه الکتاب والحکمة والتوراة والانجیل﴾ (آل عمران: ۴۸) یا آل ابراہیم کے سلسلے میں قرآن مجید کا یہ بیان کہ ﴿فقد آتینا آل ابراهیم الکتاب والحکمة﴾ (نساء:۵۴) یا حضرت لقمان کے حوالے سے یہ کہنا ﴿ولقد آتینا لقمان الحکمة﴾ (لقمان:۱۲) گویا اس خیال کی تائید ہے کہ حکمت کو محمد رسول اللہؐ کی سنت پر محمول کرنا ان قرآنی بیانات کی صحیح تفہیم نہیں قرار دیا جا سکتا کہ اگر حکمت سے مراد سنت رسول لیا جائے تو یقیناً احادیث وروایات کے مجموعے آل ابراہیم حضرت مسیحؑ اور لقمان پر نازل نہیں کیے گئے تھے۔

بعض شارحین نے کتاب وحکمت کی ثنویت کا ایک حل یہ نکالا کہ انھوں نے حکمت کو قرآن سے باہر تلاش کرنے کے بجائے خود کتاب کے اندر اس کی موجودگی کی نشاندہی کی۔ اس میں شبہ نہیں کہ قرآن نے خود اپنے آپ کو ایک جگہ حکمة بالغه سے تعبیر کیا ہے۔ البتہ مختلف مقامات پر کتاب کے ساتھ حکمت کا لاحقہ اس بات کا اعلان ہے کہ اس کتاب عظیم کی عقدہ کشائی اور اس کی تجلیوں سے اپنی راہوں کو منور کرنے کے لیے حکمت کا سہارا لازم ہے پھر یہ حکمت ہے کیا؟ قرآنی بیان کے مطابق یہ وہی شئے ہے جو داؤد کی ملک گیری میں ان کی رفیق وپاسبان بنی اور کتاب وحکمت کا یہی تحفہ جب آل ابراہیمؑ کو عطا ہوا تو مقتدر حکمرانی ان کے حصّے میں آ گئی ﴿فقد آتینا آل ابراهیم الکتاب والحکمة واتیناهم ملکا عظیما﴾ (نساء۔۵۴) خدا جسے چاہتا ہے حکمت سے نواز دیتا ہے ﴿یوتی الحکمة من یشاء﴾ (بقرۃ۔۲۶۹) اور جسے خدا حکمت سے نواز دے گویا اسے خیر کثیر سے نوازا گیا۔ ان قرآنی بیانات سے بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حکمت ایک ایسا خیر کثیر اور ایک ایسی نعمت عظیم ہے جو اقوام وملل کو استخلاف فی الارض کی مسرتوں سے ہمکنار کرتی ہے۔ داؤد وسلیمان کی سلطنتوں کی جاہ وحشم اسی حکمت کے نتیجے میں

قائم ہوا تھا اور خود آپؐ پر آنے والی وحی ایک ایسی عقل حکیم اور قلب سلیم کی تعمیر کا کام کر رہی تھی جس کے نتیجے میں آنے والے دنوں میں استخلاف فی الارض اس کا مقدر تھی۔ معاصرانہ بیان میں اگر کہا جائے تو مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ حکمت سے مراد ایک ایسے عقلی رویہ کی تشکیل و تعمیر ہے جو کائنات کو تماشائے محض سمجھنے یا اس کی سریت سے خوف کھانے کے بجائے اس کی تسخیر کا فریضہ انجام دے سکے۔ داؤد نے اسی عبودیت کاملہ سے سرشار ایک عقلی رویے کے ذریعے ایک ایسی سلطنت کی تشکیل دی جس کی حکمرانی شرق و غرب، پہاڑوں اور پرندوں تک مہیب تھی۔ قرآنی بیان کے مطابق پہاڑوں کو ان کے لیے اس طرح مسخّر کر دیا گیا کہ وہ بھی ان کے ساتھ خدا کی حمد میں رطب اللسان رہتے اور اسی طرح پرندے خدا کی تمہید میں ان کے شریک و سہیم نظر آتے اور یہ سب کچھ اسی لیے ممکن ہو سکا کہ ﴿وآتیناہ الحکمۃ و فصل الخطاب﴾ (ص:۲۰) داؤد و سلیمان کی جاہ و حشم کے بیان میں جن محیر العقول ایجادات کا تذکرہ ملتا ہے پہاڑوں اور فضاؤں پر ان کا کمند ڈالنا، پرندوں اور چیونٹیوں پر ان کی حکمرانی دراصل اسی خیال کی توثیق کرتی ہیں کہ حکمت اگر وحی کی رفیق بن جائے تو انسان کے لیے کائنات کی تسخیر صرف آسان ہی نہیں ہوتی بلکہ وہ فطرت سے ہم آہنگ ایک ایسی جنت ارضی کی تشکیل کر سکتا ہے جہاں خدا کے انعامات پر لقمان کی طرح مومنین کے سر شکر سے جھک جاتے ہوں اور جہاں داؤد ان تمام انعامات سے لطف اندوز ہونے کے باوجود اپنا شمار اوّاب میں کراتے ہوں۔

۵۳۔ جابر بن حیان (محولہ فواد سیزگن، ص ۲۲۷)

۵۴۔ القانون المسعودی، ج ۱، ص ۵–۴۔

۵۵۔ تاریخ کا یہ بھی عجیب طنز ہے کہ نزولِ قرآن سے تسخیر و اکتشاف کی جو غلغلہ انگیز تحریک بلند ہوئی اور جس کے نتیجے میں تجرباتی اور مشاہداتی منہجِ علمی کو فروغ نصیب ہوا اسے آج مغرب میں فرانسس بیکن کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔ بیکن نے ارسطو کی Organon کے مقابلے میں Novam Organum شائع کیا جس میں تجربے اور مشاہدے کو علم کی بنیاد قرار دیا گیا۔ آگے چل کا بیکن کا یہ منہجِ علمی سائنسی طریقۂ کار کے طور پر متعارف ہوا۔ اور اس طرح یہ سمجھا جانے لگا کہ جدید دنیا جو تجرباتی سائنس کے نتیجے میں وجود میں آئی ہے اس کے بانی مبانی کی حیثیت فرانسس بیکن کو حاصل ہے۔ علمی حلقوں میں بیکن کو Father of Modern Empiricism بھی کہا جاتا ہے۔ حالانکہ جن لوگوں کو تاریخ کی معمولی سی شُد بُد بھی ہوگی ان کے لیے اس بات کا انکار کرنا مشکل ہوگا کہ غور و فکر کا جدید سائنسی منہج، جہاں منقولات سے زیادہ مشاہدات کو دخل ہے، عہد وسطیٰ کے مسلمان علماء میں ایک مقبول عام منہج کی حیثیت سے رائج رہا ہے۔ مثال کے طور پر ابن الہیثم کو لیجیے جو بابائے بصریات (Father of Optics) کی حیثیت سے مشرق و مغرب میں یکساں احترام سے دیکھا جاتا ہے۔ اس نے نہ صرف انسانی تجربہ اور مشاہدہ کی سرّیت کو بے نقاب کیا بلکہ اہل علم کو اس بات پر مسلسل آگاہ کرتا رہا کہ ''حقائق شبہات میں ڈوبے ہوئے ہیں۔'' ابن الہیثم کا منہج بنیادی طور پر ان شبہات کو تجربے اور مشاہدے کی میز پر پرکھنے سے عبارت ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

.....رأينا أن نصرف الاهتمام الى هذا المعنى بغاية الامكان و نخلص العناية به و نوقع الجد فى البحث عن حقيقته و نستأنف النظر فى مباديه و مقدماته و نبتدىء بالاستقراء الموجودات و تصفح أحوال المبصرات و تمييز حواص الجزئيات و نلتقط باستقراء ما يخص البصر فى حال الابصار وما هو مطرد لايتغير وظاهر لا يشتبه من كيفية الاحساس..... ثم نترقى فى البحث والمقاييس على التدريج والترتيب مع انتقاد المقدمات والتحفظ من الغلط فى النتائج و نجعل غرضنافى جميع ما نستقرئه و نتصفحه استعمال العدل لا اتباع الهوى و نتحرى فى سائر ما نميزه و ننتقده طلب الحق لا الميل مع الاراء..... فلعلنا ننتهى بهذا الطريق الى الحق الذى به يثلج الصدر و نصل بالتدرج والتلطف الى الغاية التى عندها يقع اليقين و نظفر مع النقد والتحفظ باحلقيقة التى يزول معها الخلاف و تنحسم بها مواد الشبهات ..... وما نحن من جميع ذلك براء مما هو فى طبيعة الانسان من كدر البشرية ولكننا نجتهد بقدر مالنا من القوة الانسانية ومن الله نستمد العون فى جميع الامور۔

ابن الہیثم ہی پر کیا موقوف، جابر بن حیان کا کلیۂ توازن، جس کا تذکرہ ہم پچھلے صفحات میں کر آئے ہیں، اوران کا یہ اصرار کہ "ليس لاحدان يدعى بالحق انه ليس فى الغائب إلا مثل ما شاهد او فى الماضى والمستقبل إلا مثل ما فى الآن" دراصل اسی تجرباتی منہج کا عکاس ہے جس کی بنیاد قرآن مجید کی وہ آیاتِ اکتشاف ہیں جس نے متبعین محمدؐ کو ایک نئے منہج علمی سے روشناس کرایا تھا۔ بھلا جو کتاب اپنے متبعین سے ہانکے پکارے یہ کہہ رہی ہو کہ سنريهم آياتنا فى الآفاق وفى انفسهم حتىٰ يتبين لهم انه الحق (فصلات:۵۳) اور جس کے ہاں بصارت کی درستگی پر اس قدر اصرار ہو کہ خدا خود کہتا ہو ما ترىٰ فى خلق الرحمٰن من تفاوت فارجع البصر هل ترىٰ من فطور ثم ارجع البصر كرتين ينقلب اليك البصر خاسأً وهو حسير (الملک:۴-۳) بھلا اس کے حاملین تجربہ اور مشاہدہ سے کیسے پہلو تہی کر سکتے تھے۔ جو کتاب اپنے متبعین سے خطاب کرتے ہوئے واشگاف الفاظ میں یہ کہتی ہو کہ وجعل لكم السمع والابصار و الافئده لعلكم تشكرون (النحل:۷۸) اور جو انھیں ان تجرباتی اور مشاہداتی خصائص کے لیے مسؤل بھی ٹھہراتی ہو: ان السمع والبصر والفواد كل اولئك كان عنه مسؤلا (الاسراء:۳۶) بھلا اس کے حاملین اس منہج علمی سے کیونکر روگردانی کر سکتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس نئے منہج علمی نے غور وفکر کے پرانے مناہج کو تہہ وبالا کر دیا۔ دیکھتے دیکھتے تسخیر واکتشاف کی ایک نئی دنیا وجود میں آ گئی۔ نزول قرآن کے بعد انسانی تہذیب پھر ویسی نہ رہی جیسی کہ وہ پہلے تھی۔

۵۶۔ جابر بن حیان، محولہ فواد سیزگن، ص ۲۲۷

۵۷۔ ابن الہیثم، الشكوك على بطليموس، حوالہ مذکور، ص ۴-۳۔

۵۸۔ رصد گاہوں کو ہمیشہ سے عالم اسلام میں مشاہداتی اور تجرباتی علوم کی علامت کے طور پر دیکھا جاتا رہا۔ عہد مامون میں شماسیہ بغداد کے بعد، جسے غالباً پہلی باقاعدہ رصد گاہ ہونے کا اعزاز حاصل ہے، آنے والے دنوں میں رَے، اسفہان اور شیراز میں قائم ہونے والی رصد گاہوں نے شہرت حاصل کی۔ البتہ مراغہ اور سمرقند کی رصد گاہوں کو ان کے محیر العقول کارناموں کے سبب انسانی تاریخ میں ہمیشہ احترام کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ سمرقند میں اُلُغ بیگ کی مشہور زمانہ رصد گاہ آج بھی ناظرین پر اس عہد کے علمی جاہ وجلال کا نقش مرتسم کرتی ہے۔ جوں جوں رصد گاہوں کے آلات میں ترقی ہوتی گئی زمین اور اس کے مابین ہماری معلومات میں قطعیت کا عنصر آتا گیا۔ رصد گاہوں کے عہد میں جب دنیا جدید الکٹرونک آلات سے بے خبر تھی محیطِ ارضی Circumference کی پیائش ۲۴،۸۳۵ میل کی گئی تھی جو موجودہ پیائش ۲۴،۹۰۶ میل سے حیرت انگیز طور پر قریب ہے۔

۵۹۔ الکندی وہ پہلا شخص ہے جس نے آسمان کے بظاہر لاجوردی نظر آنے کی توجیہہ کی۔ وہ کہتا ہے ''فضا جو زمین کا احاطہ کئے ہوئے ہے اثر پذیر ہو کر ایک ہلکی سی روشنی دینے لگتی ہے جس کا سبب وہ زمینی ناری اجزا ہیں جو اُس حرارت کے باعث منتشر ہو جاتے ہیں جسے انھوں نے زمین سے انعکاس شعاع کے سبب قبول کیا ہوتا ہے۔ (چنانچہ) ہمارے سروں پر جو تاریک فضا ہے وہ ضیائے ارضی اور ضیائے کوکبی کے امتزاج سے تاریکی اور اجالے کی بین بین ایک رنگ میں نظر آنے لگتی ہے اور وہی یہ لاجوردی رنگ ہے''۔ (محولہ فواد سیزگن ص، ۱۳۶)

۶۰۔ بقول الکندی ''جب سورج شمالی جھکاؤ میں ہوتا ہے تو شمالی جانب کے مقامات گرم ہو جاتے ہیں اور جنوبی جانب کے مقامات سرد ہو جاتے ہیں۔ نتیجتاً شمالی ہوا اپنی حرارت کے باعث پھیلتی اور جنوب کی سمت رواں ہوتی ہے کیونکہ جنوبی ہوا سرد ہو جانے کے باعث سکڑ چکی ہوتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ موسم گرما کی اکثر ہوائیں شمالی اور موسم سرما کی اکثر ہوائیں جنوبی ہوتی ہیں''۔

تو کیا اٹھارہویں صدی کے مغربی اہل اکتشاف الکندی کی ان توجیہات سے واقف تھے؟ واقعہ یہ ہے کہ جیسے جیسے مغرب میں نشاۃ ثانیہ کے اصل ماخذ کا ہمیں ادراک ہوتا جائے گا اس قسم کے تہذیبی تعاملات پر فیصلہ کن گفتگو ممکن ہو سکے گی۔ اس بارے میں کسی قدر تفصیلی گفتگو کے لیے پانچواں باب ملاحظہ فرمائیں۔

۶۱۔ مغرب میں ایک طویل عرصہ سے Mural Quadrant کو Tycho Brahe کی ایجاد سمجھا جاتا رہا ہے۔ حالانکہ اس بات کے وافر شواہد موجود ہیں کہ یہ آلہ البیرونی کی دسترس میں تھا ورنہ وہ صحرا نوردی کے بغیر پیائشِ محیطِ ارضی کی بات نہ کرتا۔ اس کے علاوہ نصیر الدین طوسی کی رصد گاہ میں بھی اس کا استعمال عام تھا۔ استنبول میں واقع تقی الدین کی رصد گاہ میں آج بھی یہ آلہ ہمیں تاریخی التباسات کی درستگی کی دعوت دے رہا ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھئے۔

A. Y. Al-Hassan, (ed.), *The Different Aspects of Islamic Culure.* Vol 4: Science and Technology in Islam. Paris: UNESCO Publishig, pp. 235-265.

۶۲۔ مامون کا خریطۂ عالم گو کہ یونانی تصور عالم کے مطابق دنیا کو ہفت اقالیم میں منقسم دیکھتا ہے البتہ اس اعتبار سے یہ

دنیا کا پہلا نقشہ ہے جو دنیا کے 530 اہم شہروں، پانچ سمندروں، 290 دریاؤں، دوسو پہاڑوں کے علاوہ مختلف علاقوں میں پائی جانے والی قیمتی دھات اور پتھروں کا تذکرہ کرتا ہے۔ المسعودی نے اس منصوبے کی وسعت اور ہمہ گیری پر قدرے تفصیل سے کلام کیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔ کتاب التنبیة و الاشراف۔

۶۳۔ البیرونی کے عہد تک علوم ارضیات کے مختلف مدارس فکر پائے جاتے تھے مثال کے طور پر عباسی خلیفہ المنصور (۷۵۔۷۵۳) کے زمانے میں اس موضوع پر سنسکرت سے سوریہ سدھانت کا عربی میں ترجمہ ہو چکا تھا۔ اس کے علاوہ آریہ بھٹ کی قدیم تصنیف سے بھی عرب ناواقف نہیں تھے جس میں ارض وسمٰوات کی گردش پر بحث کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتایا گیا تھا کہ اس زمین پر پانی اور خشکی کے حصے تقریباً برابر برابر ہیں۔ S. Maqbul Ahmad "Djughrafiya." in *Encyclopedia of Islam* Leiden: Brill, 1991, vol 3. p. 575-587.

۶۴۔ ملاحظہ ہو: ابوریحان البیرونی، کتاب تحدید نهاية الاماكن لتصحيح مسافة المساكن۔

۶۵۔ ابن الہیثم نے اپنی جس شہرۂ آفاق تصنیف الشكوك على بطليموس میں بطلیموسی نظام کو قیاس مع الفارق قرار دیا۔ وہ غالباً لاطینی زبان میں ترجمہ ہونے سے رہ گئی جیسا کہ George Saliba کا خیال ہے۔ ابن الہیثم نے سیاروں کی حرکات کی جو توجیہہ پیش کی اور جسے اس نے نظام طبعی کا نام دیا اس کی وضاحت وہ اس طرح کرتا ہے:

> ''وہ مقدمات جن پر کواکب، نیز عالم کے گرد حرکت کرنے والے تمام اجرام کے مداروں کی ترکیب مبنی ہے، چار ہیں۔ ایک یہ کہ جسم طبیعی خود ایک سے زیادہ طبیعی حرکت نہیں کرتا۔ دوسرے یہ کہ بسیط جسم طبیعی کی حرکت میں اختلاف واقع نہیں ہوتا یعنی وہ گردش کے دوران ہمیشہ برابر وقت میں برابر فاصلہ طے کرتا ہے۔ تیسرے یہ کہ جسم آسمانی انفعال کو قبول نہیں کرتا اور چوتھے یہ کہ خلا موجود نہیں ہے۔'' (محولہ فواد سیزگن ص، ۱۰۳۔۱۰۲)

۶۶۔ ابوریحان البیرونی (متوفی ۱۰۴۸ء) نے اپنی جس تصنیف میں بطلیموس کو ہدف ملامت بنایا ہے اس کا صرف تذکرہ تاریخ کی کتابوں میں ملتا ہے۔ ابطال البهتان باراد البرهان کے حوالے سے قطب الدین شیرازی (متوفی ۱۳۱۱ء) نے بیرونی کا یہ قول نقل کیا ہے۔ محولہ

Georg Saliba, *A History of Arabic Astronomy: Planetary Theories During the Golden Age of Islam,* New York University Press, 1994, p. 279.

۶۷۔ کوپرنکس سے کوئی ڈیڑھ سو سال پہلے ابن شاطر (متوفی ۱۳۷۵ء) نے بطلیموسی نظام کو مسترد کرتے ہوئے جس نئے نظام کو دنیا کے سامنے پیش کیا تھا وہ وہی کچھ تھا جس کا سہرا کوپرنکس کے سر باندھا جاتا ہے۔ کوپرنکس اور ابن شاطر کے نقشوں پر کوئی اگر ذرا بھی ایمانداری سے نگاہ ڈالے گا تو اس بات کا اندازہ لگانا مشکل نہ ہوگا کہ کوپرنکس کی تمام تر تحقیق ابن شاطر اور ان کے دیگر مسلم متقدمین کی علمی کاوشوں کا چربہ ہے۔ ملاحظہ ہو نقشہ ایک[1] اور دو[2] سے نقشہ تین[3] کی مماثلت:

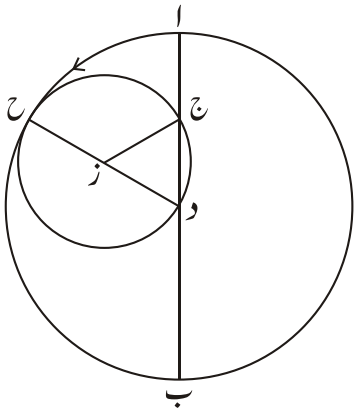

نقشہ ایک[۱] اور دو[۲] نصیر الدین طوسی کی مشہور زمانہ کتاب تذکرہ فی علم الھیئة ۱۲۶۱ء سے ماخوذ ہے۔

جس میں سیاروں کی گردش الصغیرہ والکبیرہ (Tusi Couple) کے ذریعے ظاہر کی گئی ہے۔ اس نقشہ میں دو دائرے ہیں جس میں چھوٹے دائرے کا قطر بڑے دائرے کا نصف ہے۔ بڑے قطر کو الف، ح، د، ب سے ظاہر کیا گیا ہے۔ یہاں چھوٹے دائرے کے بارے میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ گھڑی کی سمت گھومتا ہے جب کہ بڑا دائرہ مخالف سمت میں اس کی آدھی رفتار سے گردش کرتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بظاہر ح اپنی گردش کے باوجود الف اور ب کے درمیان ہی نظر آتا ہے۔

نقشہ دو[۲] میں میں طوسی نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ چھوٹا دائرہ جب بڑے دائرے کے اندر اس کی دوگنی

رفتار سے مخالف سمت میں گردش کرتا ہے تو ناظرین کے لیے یہ منظر اپنے اندر کیا معنی رکھتا ہے۔ سب سے پہلے خانہ میں جب چھوٹا دائرہ بڑے دائرے کے نصف اوپری حصہ میں ہوتا ہے وہ اس طرح کہ بڑا دائرہ گھڑی کی الٹی سمت اور چھوٹا دائرہ گھڑی کی سمت میں گردش کرتا ہے تو بالآخر چوتھے خانے کی صورتحال پیدا ہو جاتی ہے۔ جس کی حقیقت

یہ ہے کہ یہاں چھوٹا دائرہ ڈیڑھ مرتبہ گھوم چکا ہوتا ہے جب کہ بڑا صرف تین چوتھائی گھومتا ہے۔ یہ صورتحال جب دور سے دیکھی جائے تو ایسا محسوس ہوگا کہ چھوٹا ہمیشہ بڑے کے قطر پر ہی گھومتا رہا ہے۔

اب طوسی کے ان ڈائیگرام کا نکولائی کوپرنکس کے ڈائیگرام سے تقابلی مطالعہ کریں تو حقیقتِ حال کو سمجھنے میں کچھ دشواری پیش نہیں آتی۔

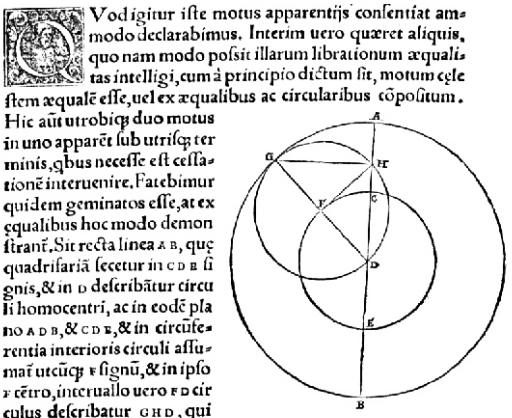

QVod igitur iste motus apparentijs consentiat ammodo declarabimus. Interim uero quæret aliquis, quo nam modo possit illarum librationum æqualitas intelligi, cum à principio dictum sit, motum cęlestem æqualẽ esse, uel ex æqualibus ac circularibus cõpositum. Hic aũt utrobiq; duo motus in uno apparẽt sub utrisq; terminis, qbus necesse est cessationẽ interuenire. Fatebimur quidem geminatos esse, at ex ęqualibus hoc modo demonstrantĩ. Sit recta linea A B, quę quadrifariã secetur in C D E signis, & in D describãtur circuli homocentri, ac in eodẽ plano A D B, & C D E, & in circũferentia interioris circuli assumatĩ utcũq; F signũ, & in ipso F cẽtro, interuallo uero F D circulus describatur G H D, qui secet A B rectã lineã in H signo, & agatĩ dimetiẽs D F G. Ostẽdendũ est, q geminis motibus circulorũ G H D & C F E cõcurrẽtibus in-

Source: *De Revolutionibus Orbium Coelestium* (1543)

سب سے پہلی بات تو یہ سمجھ لینے کی ہے کہ کوپرنکس نے اپنی ڈرائنگ میں Tusi Couple کا ہی سہارا لیا ہے اس کا کارنامہ صرف اتنا ہے کہ اس نے عربی تہجی کو رومن حروف سے بدل کر ایک خالص یورپی بازیافت کا تاثر دینے کی کوشش کی ہے۔ یہ خیال کہ بطلیموسی نظام حرکت کائنات کی صحیح تصویر پیش نہیں کرتا مسلم ماہرین فلکیات کے درمیان خاصا مقبول رہا ہے۔ سب سے پہلے ابن الہیثم (متوفی ۱۰۴۰ء) نے بطلیموسی نظام کی کھل کر تنقید کی البتہ ایک متبادل نظام کا تصور ابن شاطر (متوفی ۱۳۷۵ء) کے لیے مقدر تھا جسے پیرا میٹر کی تھوڑی سی تبدیلی کے بعد (یعنی زمین کے بجائے سورج کو مرکز قرار دے کر) کوپرنکس نے مغرب میں متعارف کرایا۔ کوپرنکس اور گلیلیو کی مشترکہ کوششوں کے سبب اہل مغرب کو ایسا محسوس ہوا گویا انھوں نے کائنات کی حرکت کا راز دریافت کر لیا ہو۔ اس احساس نے بعض بنیادی فکری تبدیلیوں کی اینٹ رکھ دی۔

۶۸۔ ۱۹۵۷ء میں غالباً پہلی بار اہل علم کو اس بات کا انکشاف ہوا کہ کوپرنکس سے کوئی ڈیڑھ دو سو سال پہلے ابن شاطر نے Tusi Couple کی بنیاد پر جو نیا خاکہ ترتیب دیا تھا اس میں زمین کی جگہ سورج کو رکھ کر کوپرنکس نے مغرب میں خود کو اس فن کے امام کی حیثیت سے پیش کر دیا۔ اس بات کے تاریخی شواہد موجود ہیں کہ ابن شاطر کی کتاب نهاية السول فی تصحيح الاصول پندرہویں صدی میں اٹلی میں پہنچ چکی تھی۔ بعضے یہ بھی کہتے ہیں کہ ویٹیکن کی

لائبریری میں یقیناً کوپرنکس نے اس کتاب کا مطالعہ کیا ہوگا کہ اس کتاب کا ویٹیکن کی لائبریری میں پایا جانا اور کوپرنکس کا وہاں جانا تاریخ سے ثابت ہے۔ یہی وجہ ہے ابن شاطر اور کوپرنکس کے ڈائیگرام میں حیرت انگیز طور پر مماثلت پائی جاتی ہے۔

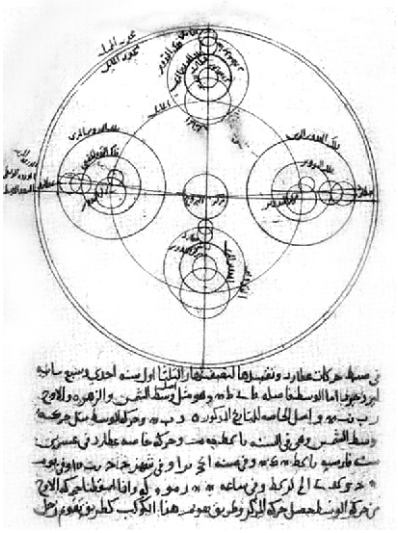

ملاحظہ کیجئے بطلیموسی نظام کے بالمقابل ابن شاطر کا تصور جہاں الصغیرہ والکبیرہ (Tusi Couple) کی مدد سے عطارد کے مقام کی نشاندہی کی گئی ہے۔

اس بارے میں مفصل بحث کے لیے ملاحظہ کیجئے :

George Saliba *A History of Arabic Astronomy: Planetary Theories during the Golden Age of Islam*, New York, 1994, p. 236.

George Saliba, Islamic Science and the Making of European Renaissance, London, 2007.

George Saliba (2007), Lecture at SOAS, London-Part 4/7 (http://youtube.com/watch?v=GfissgPCgfM) and Lecture at SOAS, London-Part 5/7 (http://youtube.com/watch?v=OVMBRAd6YBU)

۶۹۔ جابر نے پہلی بار اشیاء کے خواص کی عددی توجیح کے ذریعے ایک ایسے علم کی بنیاد رکھ دی جو آگے چل کر حیرت انگیز علمی انقلاب کا باعث ہوئی۔ پھر انسانوں کے لیے ممکن ہوگیا کہ وہ مختلف اشیاء میں اجزاء کا پتہ لگا سکیں اور اس کی ترتیب وتزئین میں ردّوبدل کے ذریعے نئی اشیاء کی تخلیق کریں۔ جابر کے مطابق توازن یا المیزان کا یہ اصول جس نے دریافت کرلیا اسے گویا کائنات کے بنیادی راز سے آگہی حاصل ہوگئی۔ (محولہ فواد سیزگن، ص ۷۷)

۷۰۔ عہد وسطیٰ میں عالم اسلام کو ایک ایسی غالب تہذیب کی حیثیت حاصل تھی جہاں سے فکری وادبی رجحانات کو برآمد

کرنا باعث فخر سمجھا جاتا۔ مغربی اہل فکر عالم اسلام کی طرف اسی مرعوبانہ نگاہ سے دیکھتے جس طرح آج تیسری دنیا کے ممالک مغرب کی طرف دیکھتے ہیں۔ عالم اسلام کے علمی مباحث سے باخبری، فیشن کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ اس پس منظر میں اگر جابر کے تکوینی تخیلات نے Faust کی تحریروں اور Mary Shelley کی Frankenstein کی تخلیق کا سبب بنے ہوں تو اس پر کچھ تعجب نہ ہونا چاہئے۔

۷۱۔ محولہ فواد سیزگن، تاریخ علوم میں تہذیب اسلامی کا مقام، ص ۴۵۔

۷۲۔ کہا جاتا ہے کہ کوئی تین سو سال بعد جب رابرٹ آف چیسٹر (Robert of Chester) نے اس کتاب کے بعض حصوں کا ترجمہ لاطینی میں *Liber Algebras et Almucabola* کے نام سے کیا تو اس وقت تک یورپ میں اس علم کی لوگوں کو ہوا بھی نہ لگی تھی۔

۷۳۔ ملاحظہ کیجئے: ابوالحسن احمد بن ابراہیم الاقلیدسی، الفصول فی الحساب الہندی، عمان، ۱۹۷۳ء

۷۴۔ فواد سیزگن، حوالہ مذکور، ص ۸۹)

۷۵۔ فواد سیزگن، حوالہ مذکور، ص ۸۶

۷۶۔ الکاشی ان نابغۂ روزگار علمائے اکتشاف میں تھا جنھیں سمرقند میں اُلغ بیگ (متوفی ۱۴۴۹ء) نے اعلیٰ تحقیق کے لیے مدعو کیا تھا۔

الکاشی نے دائرے کے Circumference اور Redius کے مابین 6.28318530717955865 کا تناسب دریافت کیا جو آج بھی بڑی حد تک صحیح ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھئے: Berggren. J. L. *Episodes in the Mathematics of Medieval Islam.* New York, 1986, pp. 15-21, pp. 151-154.

۷۷۔ اسلامی معاشرے میں اخوت باہمی کے سبب لوگوں کا ایک دوسرے سے ملنا جلنا، امیر و غریب، شاہ و گدا کا ایک دسترخوان پر کھانا مساوات کا ایک انبساط انگیز منظر پیش کرتا ہے۔ چھوت کی بیماری، یعنی بعض متعدی جرثوموں کا دوسرے افراد کو منتقل ہونے کا خیال، علمائے فقہ کو ان کے اپنے مذعومہ اسلامی تصور مساوات سے متصادم نظر آیا۔ لہٰذا لسان الدین الخطیب (متوفی ۷۷۶ھ) کو اپنی کتاب مقنعة السائل عن المرض الهائل میں لکھنا پڑا: سو اگر کہا جائے کہ ہم چھوت کے دعوے کو کیونکر تسلیم کر لیں جب کہ شرع میں اس کی نفی آئی ہے تو ہم کہیں گے کہ چھوت کا وجود تجربہ، استقراء، حس، مشاہدہ اور مسلسل اطلاعات سے ثابت ہے اور ان سب پر اس دلیل کی بنیاد ہے۔ جو کوئی اس مسئلہ پر غور کرتا ہے یا اسے اس کا ادراک حاصل ہے اس سے مخفی نہیں رہتا کہ جو بھی اس مرض کے مریض سے براہ راست رابطہ رکھتا ہے اکثر و بیشتر ہلاک ہو جاتا ہے اور جو نہیں رکھتا وہ بچ جاتا ہے۔ اسی طرح سے کسی کپڑے یا برتن کے سبب سے پورے گھر یا محلے میں مرض پھیل جاتا ہے حتیٰ کہ کان کی بالی جس نے پہن لی اس نے اسے ختم کر دیا اور پورے گھر کا صفایا ہو گیا۔ یہ مرض کسی شہر کے ایک گھر میں پیدا ہوتا ہے اور پھر اکا دکا ملنے جلنے والوں اور پھر ان کے پڑوسیوں میں پھیل جاتا ہے۔ محولہ فواد سیزگن، ص ۴۷۔

۷۸۔ رازی نے اپنی کتاب شکوك میں جالینوس کو ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مجھے اس بات کا دکھ ہے کہ میں ایک ایسے آدمی پر تنقید کر رہا ہوں جس کے سمندرِ علم سے میں نے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ لیکن مجھے احساس ممنونیت اور عظمت اس بات سے نہیں روکتی کہ میں ان غلطیوں کی طرف اشارہ کروں جو مجھ پر منکشف ہوگئی ہیں۔

۷۹۔ فواد سیزگن، حوالہ مذکور ص، ۴۵

۸۰۔ ایضاً، ص ۴۶

۸۱۔ ایضاً، ص ۴۶

۸۲۔ ایضاً، ص ۴۶

۸۳۔ ایضاً، ص ۵۱

۸۴۔ Ehsan Masood, *Science and Islam a History,* London, 2009, p.162

۸۵۔ حوالہ مذکور، ص ۴۷

۸۶۔ ایضاً، ص ۲۷

۸۷۔ مثال کے طور پر تھیوڈور ابوقُرّہ (متوفی ۸۲۶ء) جو ایک عیسائی عالم تھے اور جنھیں اموی خلافت کے زمانے میں بعض دفتری امور کی انجام دہی پر مامور کیا گیا تھا مترجم کی حیثیت سے خاصی شہرت رکھتے ہیں ثابت بن قُرّہ (متوفی ۹۰۱ء) جنھوں نے علم ہندسہ اور ریاضی کی کتابوں کو عربی میں منتقل کیا مذہباً صابی تھے۔ خود حُنین بن اسحاق جنھیں بہت سے اہم ترجموں کی نگرانی پر مامور کیا گیا وہ مذہباً عیسائی تھے۔

۸۸۔ بعض مستشرقین نے یہ تاثر عام کر رکھا ہے کہ اسلامی تہذیب یا مسلم معاشرہ سائنسی ارتقاء کے لیے مناسب ماحول فراہم نہیں کرتا۔ ان کا کہنا ہے کہ یونانی علوم جب مسلمانوں کے ہاتھ لگے تو علمائے اسلام کی مخالفت کے سبب برگ و بار نہ لا سکے لیکن وہی علوم جب مسلمانوں سے اہل یورپ کو منتقل ہوئے تو مغرب میں ایک ولولہ انگیز سائنسی انقلاب آ گیا جس نے زندگی جینے کا انداز یکسر بدل کر رکھ دیا۔ اس قسم کی دَعاوی اولاً تاریخ سے مکمل ناواقفیت پر مبنی ہیں۔ ثانیاً یہ ایک ایسی ثقافت کے پیداوار ہیں جو عہد وسطیٰ کے سائنسی ترقیات کو صرف اس لیے اہل ظلمت سے تعبیر کرتے ہیں کہ یہ ترقیاں اقوام مغرب کی سرحدوں سے باہر ہو رہی تھیں۔ یہ سارا پروپیگنڈہ ایک ایسے عہد کی پیداوار ہے جب نوآبادیاتی تسلط کے سبب مسلمان جو اپنی بقا کی جنگ لڑنے پر مجبور تھے ان غیر تاریخی پروپیگنڈہ کا سدِّ باب نہ کر سکے۔ نتیجتاً پروپیگنڈہ کی دھند دبیز ہوتی گئی اور آج عالم یہ ہے کہ ان متعصّبانہ ہفوات کو مسلّمہ تاریخی بیان کی حیثیت سے دیکھا جانے لگا ہے۔ دیکھا جائے تو اس پروپیگنڈہ کا بانی مبانی دراصل گولڈزیر ہے جس نے سب سے پہلے اپنے ایک جرمن مقالہ "Stellung der alten islamischen Orthodoxie zu den antiken Wissenschaften" (Goldziher 1915) میں اس خیال کا اظہار کیا۔ اس کی بظاہر عالمانہ تصنیف *Muhammedenische Studien* (1888)، جو بنیادی طور پر اسلام کا مطالعہ ایک finished phenomenon کی

حیثیت سے کرتی ہے، متجددین اور مستشرقین دونوں کے لئے گمرہی کا سبب بنی رہی ہے۔

۸۹۔ Johannes Pedersen, *The Arabic Book* Trans. Geoffrey French Princeton University Press, 1984, pp. 116-17

۹۰۔ حوالہ مذکور، ص ۱۲۳

۹۱۔ ایضاً، ص ۱۲۸

۹۲۔ ایضاً، ص ۱۱۹

۹۳۔ *The Cambridge History of Renaissance Philosophy,* Charles Schmitt and Quentin Skinner (ed.) Cambridge University Press, 1988, pp. 11-12

۹۴۔ *The Arabic Book* حوالہ مذکور، ص ۶۲۔

۹۵۔ ہمیں وثوق کے ساتھ نہیں معلوم کہ عہد عباسی کے ابتدائی دنوں میں بغداد میں کاغذ کی مختلف فیکٹریاں وجود میں آ گئی تھیں اس کی حرفت کہاں سے آئی۔ قرآن مجید میں رِقِ منشور اس بات کی طرف تو اشارہ کرتا ہے کہ کاغذ کی کوئی ابتدائی شکل عہد نبوی میں موجود تھی جس پر عرب شعراء اپنے معلقات لٹکاتے اور لین دین کے معاملات اور باہمی معاہدے ان پر تحریر کئے جاتے۔ صلح حدیبیہ کا معاہدہ ہو یا میثاق مدینہ کی دستاویز یا رسول اللہ کے مختلف مکاتیب جو مختلف حکمرانوں اور سرداران قبائل کو لکھے گئے یا ان سب سے بڑھ کر خود قرآن مجید کا وہ نسخہ جو مصحفِ امام کی حیثیت سے مسجد نبویؐ میں استوانہ امام کے قریب رکھا ہوتا تھا اس بات کی شہادت کے لیے کافی ہے کہ مسلمانوں کی پہلی نسل لکھنے پڑھنے کے بنیادی آلات سے متصف تھی۔ البتہ کاغذ کی ایک ایسی عوامی صنعت جہاں اسٹیشنری کے سامانوں کی کثرت ہو خاص عہد عباسی کی پیداوار ہے۔ کہا جاتا ہے کہ عربوں نے کاغذ کی ٹکنالوجی آٹھویں صدی کے وسط میں اہلِ چین سے سیکھی یہاں تک کہ آٹھویں صدی کے آخر تک اس فن میں ایسی مہارت حاصل کر لی کہ بغداد کے پیپر مِل تمام دنیا میں نفیس کاغذ کے لیے جانے جانے لگے حتیٰ کہ بعض لوگ اس کاغذ کو Bagdatixon کے نام سے پکارنے لگے۔

Jonathan Bloom, *Paper Before Print: The History and Impact of Paper in the Islamic World* Yale University Press, 2001, pp.48-51.

۹۶۔ ارسطو جس کے یہاں علم بنیادی طور پر اپنی تین ذیلی شاخوں فزکس، میٹافزکس اور میتھمیٹکس میں محدود ہے، ابتدائی صدیوں میں مسلم علماء کے لیے ایک دلفریب ماخذ کی حیثیت رکھتا تھا۔ ارسطو اس خیال کا حامل تھا کہ محض قوتِ حسّ و ادراک علم کی ماہیت سے پردہ نہیں اُٹھا سکتے لہٰذا کائنات کے بارے میں کوئی صحیح تصور قائم کرنے کے لیے احساس و ادراک کے علاوہ وجدان کو بھی اہمیت دینی ہوگی۔ قدیم یونانی ذہن اس بات کا قائل تھا کہ کائنات ازل سے ہے جسے ایک ایسی ہستی نے بنایا ہے جو ازل سے ایک قسم کے مراقبۂ نفسی (Self Contemplation) میں محو ہے۔ ارسطو کا

خدا گویا قرآن کے خدا سے یکسر مختلف تھا۔ کائنات کو خدا کی طرح قدیم ماننے سے شرک کا واضح تاثر پیدا ہوتا تھا۔ مسلم علماء و مفکرین کے لیے کائنات کا یہ تصور قابل قبول نہیں ہوسکتا تھا۔ دانش یونانی کی ان مداخلتوں نے اگر ایک طرف فکری التباس کے امکانات کو جنم دیا تو دوسری طرف بالغ نظر مسلم ذہن کو بے لاگ تحلیل و تجزیہ کے لیے تحریک بھی ان ہی بیرونی فکری مداخلتوں سے ملی۔ مسلمانوں کے لیے خدا کا قرآنی تصور دین و ایمان کا مسئلہ تھا لہٰذا تمام فلسفیانہ موشگافیوں کے باوجود کائنات کا ازلی و ابدی اور قدیم ہونا قابل قبول نہ ہوسکا۔ گو کہ قدیم و حادث کی بحث نے خلق قرآن کے مسئلہ پر ایک زبردست ذہنی تشتت کو جنم دیا (جس کا تذکرہ ہم آگے کریں گے)۔ البتہ ارسطو کے الٰہیاتی نظام کے استرداد کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ اس کی تصنیفات کی حتمی حیثیت خاصی مشکوک ہوگئی۔ یہی وجہ تھی کہ آنے والے دنوں میں علوم کو محض تین ذیلی شاخوں میں محدود سمجھنے کے بجائے لامتناہی امکانات کا حامل سمجھا گیا اور مسلمان اہل فکر و فن نے علوم عقلیہ اور نقلیہ میں بے شمار ذیلی شاخوں کے تحت تحقیق و اکتشاف کی طرح ڈال دی۔ اگر ایک طرف کتاب الطهارة، كتاب الزكوٰة، كتاب المعاملة، كتاب البيع اور كتاب الوراثة تخصیص کے میدان قرار پائے تو دوسری طرف فطری سائنس میں كتاب المناظر، كتاب التحديد نهاية الاماكِن، كتاب الهندسة اور كتاب النجوم جیسی تصانیف نے علوم کی بے پایاں وسعت کا اعلان کر دیا۔

۹۷۔ گو کہ کندی، فارابی، ابن سینا اور ابن رشد بڑی حد تک ارسطاطالیسی نظامِ فکر کے مؤید اور مبلغ رہے لیکن قرآنی دائرۂ فکر کی اثر انگیزی کا یہ عالم تھا کہ ارسطو کی علمی عظمت ہر دور میں مسلسل تحلیل و تجزیہ کا موضوع بنی رہی۔ اسے اگر حرف آخر کے طور پر قبول کر لیا جاتا تو اسلامی تہذیب محض یونانیوں کا ایک چربہ قرار پاتی۔ تہذیب کے ارتقاء کا عمل یکسر رک جاتا۔

۹۸۔ عہد مامون میں دانش یونانی کو اس قدر استناد حاصل ہو گیا تھا کہ اسے فکر اسلامی کا معاون و رفیق سمجھا جاتا تھا حتیٰ کہ شرع کی بصیرت اور توحید کی معرفت میں بھی حکمائے یونان کو قولِ فیصل کی حیثیت حاصل ہوگئی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ مامون نے ایک دن خواب میں ارسطو کو ایک تخت پر متمکن دیکھا۔ مامون نے اس مرد بزرگ سے دریافت کیا کہ بھلائی فی الواقع ہے کیا؟ ارسطو نے کہا: وہ چیز جو عقل کے نزدیک بھلی ہو۔ مامون نے پھر پوچھا اور اس کے بعد؟ ارسطو نے کہا جو شریعت کی نظر میں بھلی ہو۔ اور اس کے بعد؟ کہا جسے لوگ بھلا کہیں۔ پھر پوچھا اور اس کے بعد؟ جس کے جواب میں ارسطو نے کہا اس کے بعد کوئی بعد نہیں ہے۔ اسی موقع پر مامون نے ارسطو سے درخواست کی کہ کچھ نصیحت فرمایئے۔ کہا توحید کو تھامے رکھو۔ کہا جاتا ہے کہ شاید اسی خواب کا اثر تھا کہ مامون نے حکمائے یونان کی کتابوں کے تراجم کو اپنی زندگی کا مشن بنا ڈالا اور شاید اس لیے بھی کہ مامون کے ذہن میں دانش یونانی اور وحی ربانی میں کوئی نظری تعارض نہ تھا۔ بقول ابن الندیم:

فكان هذا (المنام) من اوكدالا سباب فى اخراج الكتب فان المامون كان بينه و بين الملك الروم مراسلات وقد استظهر عليه المامون فكتب الى ملك الروم يسأله

الاذن فی انفاذ ماعنده من مختار من العلوم القدیمة المخزونة المدخرة ببلاد الروم فاجاب الی ذلك بعد امتناع فاخرج المامون لذلك جماعة... فاخذوا اهما وجدوا مااختاروا فلما حملوا الیه امرهم بنقله فنقل۔ (الفهرست، ص ۱۳۹)

۹۹۔ مراد ہیں ٹوبی حف (Toby Huff) جن کی کتاب *The Rise of Early Modern Science* کے حوالے اس باب میں پہلے بھی آئے ہیں۔